اپنی آہٹیں

عظیم اقبال

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون بھی شامل ہے

نام کتاب : اپنی آہٹیں

مصنف : عظیم اقبال

ترتیب و تزئین : شمس الہدیٰ بتیاوی

سن اشاعت : ۱۹۹۶ء

قیمت : [illegible] روپئے

تعداد : ایک ہزار

صفحات : ایک سو چونسٹھ

کتابت : مجیدی سنہاروی۔

طابع : آزاد پریس، سبزی باغ پٹنہ۔۴

ناشر : انجلی پبلی کیشنز بھنور پوکھر پٹنہ۔۴

مصنف کا پتہ :

عظیم اقبال۔ گنج نمبر ۱ بتیا۔ (مغربی چمپارن)، بہار

ملنے کا پتہ

1۔ دفتر انجلی، اردو ہفتہ وار، بھنور پوکھر۔ پٹنہ۔۴

2۔ بک امپوریم۔ سبزی باغ۔ پٹنہ۔۴

انتساب

"اُسے

جس کی یاد

دل کی زندگی ہے!"

—— عظیم اقبال

اپنی آہٹیں

افسانوی مجموعہ

——— عظیم اقبال

"سایہ زُلف کا"

ایک ادا سے وہ مُسکرائی۔ ہونٹ کو سکوڑ کر آخری گوشوں میں لپ اسٹک کی تہہ برابر کرنے لگی۔ اُسی لمحے اُس کے سامنے شکیل کی پرچھائیاں اُبھر آئیں۔

"نیلم! جب کبھی تم مسکراتی ہو، چاند تاروں کی روشنی مدّھم ہونے لگتی ہے، ہوا مُشک بار ہو جاتی ہے، گھٹائیں رقص کرتی ہیں......"

نیلم نے ایسا محسوس کیا، شکیل نے اپنی گرم ہتھیلی اُس کے رُخسار سے مَس کر دی ہو۔ اُس کے وجود کے دلنشیں سائے اُسے مدہوش کرنے لگے۔ اُس کی رگوں میں چنگاریاں جل اُٹھیں۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے عیاں ہو گئے۔

"میرے خدا! ابھی تم سنگھار میں لگی ہو۔ وہاں خالہ جان چیخ چیخ کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ چھ بج گئے! جلدی کرو! فلم چھوٹ جائے تو خاک مزہ آتا ہے!"

آئینے میں زینت کے نقوش واضح ہو گئے تھے۔ نیلم نے اُدھر نگاہیں اُٹھائیں۔ اُس کے سراپا کا سرسری جائزہ لیا۔

۲

"بس آپی بس ! لیکچر ختم بھی کیجئے۔ ممی کی طرح آپ بھی بولنے لگتی ہیں ـــــ آئی ایم کوائٹ ریڈی۔ چلئے نا۔ کیا گھور رہی ہیں؟ بالوں کی چھوٹی سی لٹ آپ کی پیشانی پر کیسی بھلی لگتی ہے! مائی ڈارلنگ آپی! کہاں کھوئی ہیں؟ دیکھئے نا۔ سچ کہئے۔ کیسی لگتی ہوں میں؟ یہ جوڑا مجھے فٹ آیا ہے نا؟ کاجل کی لکیریں ہموار تو ہیں؟ گالوں کی سرخی پھیلی تو نہیں؟ پاؤڈر کا داغ تو نہیں رہ گیا!۔"

نیلم کے اعضا زینت سے یقیناً زیادہ متناسب تھے۔ اتنی کم سنی میں نیلم شعلۂ جوالہ معلوم ہوتی۔ زینت کے بدن میں اتنا تناسب نہ تھا، نہ اتنی لچک۔ چہرہ کتابی تھا۔ اُچھل اُچھل کر چلتی تھی۔ ہنستی تھی تو گھٹی گھٹی چیخ نکلتی تھی۔ نیلم کی آواز میں شیرینی کی گھلاوٹ تھی۔

"قیامت! سر سے پیر تک ایک محشر بپا کئے ہوئے ـــــ اگر میں لڑکا ہوتی ....!"

"دھت! آپی ـــــ! مجھے بنانے لگیں" ـــــ نیلم شرما گئی۔ زینت نے اُسے باہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

کچھ دنوں سے نیلم اپنے اندر بہت ساری تبدیلیاں محسوس کر رہی تھی۔ یکایک جسم پر گوشت کی تہیں موٹی ہونے لگی تھیں۔ ہتھیلیاں گرم رہتیں۔ رخسار تپ رہے ہوتے۔ خوشگوار موسم میں بھی پسینے کی بوندیں گالوں پر ابھر آتیں۔ گھڑی گھڑی طبیعت اُداس رہتی۔ تنہائی کے اوقات سکون بخش ہوتے۔ طرح طرح کے خیالات میں کھو جاتی۔ غسل خانے کے قدِ آدم آئینے میں اکثر اُس نے اپنی شبیہہ جی بھر کے دیکھی تھی۔ تن کر انگڑائیاں لی تھیں۔ اُس وقت اُسے کسی فلم کی ہیروئن یاد آ جاتی۔ پورا منظر نگاہوں میں گھوم جاتا۔ ہیرو اور ہیروئن کی رومانی باتیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ جاتے۔ کسی خمار کے زیرِ اثر لڑکھڑا جاتی۔ تھکے ہاتھوں سے شاور کھول دیتی۔

پانی کی پھواریں خنک قطرے تیزی سے اُس کے بدن کے نشیب و فراز میں لڑھکنے لگتے۔

اُس کی پلکیں بند ہو جاتیں ——— دیر تک پُورے بدن پر صابن کے مُلائم جھاگ ملتی رہتی۔ کیف کی ترنگیں اُس کی نسوں میں رواں ہو جاتیں۔ لطیف گدگدی کا احساس ہوتا۔ پھر وہ چونک جاتی، گھبرا جاتی، خود سے حجاب آنے لگتا۔

"مائی گڈنس! یہ کیا ہوتا جا رہا ہے مجھے!"

وہ سوچتی ——— "یہ کیا دیوانہ پن ہے؟ جی چاہتا ہے خوب قہقہے لگاؤں۔ فضاؤں میں اُڑتی پھروں! کوئی مجھے ...."۔ اُس کی سانسیں اُبلنے لگتیں۔ ایسے میں ممی کی ڈپٹ سُنائی دیتی۔

"سارا دن نہاتی رہو گی کیا؟ زکام ہو جائے گا! جلدی باہر آؤ ———"

اِس آواز پر نیلم کسی اناڑی مجرم کی طرح سہم جاتی۔

بالوں کو شانے پر بکھیر کر دیر تک بالکونی میں چکّر لگاتی تھی۔ خمدار کمر سے بھی نیچے اُس کے بالوں کے آخری سرے جھولتے رہتے۔ ہوا چلتی تو لٹیں اُڑنے لگتیں۔ نیچے گلی میں آتے جاتے لوگ اُچٹتی سی نظر اُوپر ڈالتے۔ پھر اُن کی نگاہیں نیلم پر منجمد ہونے لگتیں۔ کوئی ٹھنڈی سانس بھرتا۔ نیلم کے جسم میں سُوئیاں سی چُبھ جاتیں۔ بے نیازی سے وہ اُڑتی ہوئی لٹوں کو سنبھالنے لگتی۔

ممی نے اپنی پسند سے اُس کی پوشاکوں کے ڈیزائن تراشے تھے۔ شلوار میں بھر کتی ہوئی گڑیا کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ چُست پاجامہ اور بدن پر چپکے ہوئے جمپر پہن کر مُغل آرٹ کا نمونہ بن جاتی۔ غرارہ اُس کے حُسن کو تمکنت بخشتا تھا۔ ممی فیشن کے رسالوں کی ورق گردانی کر کے نیلم کے لئے نئے اسٹائل تلاش کرتیں۔ نئے کپڑے پہنا کر ہر زاویے سے اُسے دیکھتیں اور سوچنے لگتیں۔ لڑکیاں کس تیزی سے ہاتھ پاؤں نکالتی ہیں۔ ابھی مہینے دو مہینے پہلے ہی نیلم نے اپنی چودھویں سالگرہ منائی تھی۔ اُس کے ڈیڈی نے

اُسے گود میں اُٹھا کر پیار کیا تھا۔ اب کیا نیلم کو دیکھ کر اُن کی ہمّت ہو سکے گی کہ اُسے قریب بھی کھینچ سکیں۔! نمّی کی سوچیں اُلجھنے لگی تھیں۔

اپنے جسم کی دلفریبیوں سے نیلم واقف تھی۔ اسکول بس میں جاتی تھی ——— سڑک پر چلتے پھرتے لوگ اُسے کس طرح دیکھتے تھے! اُس کی سہیلیاں اُسے بھینچ کر پیار کر لیتیں۔ اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ ساتھ ہی اُسے بے حد سکون کا احساس ہوتا۔ خالی گھنٹوں میں سہیلیاں اُسے گھیر لیتیں۔ اسکول کے احاطے کے کسی دُور اُفتادہ گوشے میں محفل جم جاتی۔ نیلم گاتی بھی خوب تھی۔ اُس کے گیت کے لئے سب اصرار کرتیں۔ ایک، دو، تین، چار۔ کئی کئی گیت وہ سُناتی۔ گانے میں اُسے بھی لُطف آتا تھا۔ سہیلیاں تعریف کرتی جاتیں۔ پھر آپس میں استعارے بازی ہوتی۔ آپ بیتی شروع ہو جاتی ——— مَن گھڑت قصّے سُنائے جاتے۔ کہنے سُننے کی سب کی باری آتی۔

"میرے پڑوس میں کالج کا ایک لڑکا رہتا ہے۔ میری کھڑکی اور اُس کی کھڑکی آمنے سامنے ہے۔ جب بھی میں نے پردہ سرکایا ہے وہ بے حیائی سے دانت کھسوٹتا ہے۔ کئی بار جھک کر سلام بھی کر چکا ہے۔"

"مکھڑا کیسا ہے اُس کا؟"

"بس ہے! کوئی خاص بات نہیں۔"

"تب بُرا کیا ہے؟ ایک عدد پریم پتر بھیج دو۔ وہ بزدل ہے جو دل کی بات کہتے جھجکتا ہے۔"

نیلم کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتیں۔ کچھ کہنے کی اُس کی باری آتی تو ٹال جاتی۔

"میں تو صرف گانا سُنا سکتی ہوں، کہانی نہیں۔"

"جھوٹ!"

"مکّاری کرتی ہو۔"

"تیرے حسن کی آنچ میں کون جلنا نہ چاہتا ہوگا !"

نیلم کو شدید اس کا احساس ہوتا۔

"نہیں، نہیں ——— سچ ہے ! بالکل سچ ! ——— خدا کی قسم !"

وہ بھولے پن سے کہتی۔

تنہائی میں نیلم کی بدحواسیاں اور شدّت اختیار کر لیتیں ——— ڈیڈی اکثر دَورے پر رہتے۔ بھائی جان دُور دراز جگہ پر تعلیم کے حصول میں لگے تھے۔ سال میں ایک آدھ بار آجاتے۔ گھر میں ممّی تھیں اور کئی خدمتگار۔ ممّی نیلم کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتیں۔ پہلے وہ ان سے اپنی ساری باتیں کہہ دیتی تھی، لیکن اِدھر کچھ دنوں سے اُن کے سامنے زبان ہلاتے ہوئے بھی اُسے وحشت سی ہوتی۔ اُن کی نگاہوں سے اُسے خوف آتا۔ اُن کے رُو برُو سہم سمٹ جاتی۔ وہ اس سے پیار کی باتیں کرتیں۔ مُسکراتیں۔

نیلم ٹکٹکی لگائے اُن کی طرف دیکھتی رہتی۔ ذہن خلاؤں میں بھٹک رہا ہوتا۔

"کچھ سُنتی بھی ہو۔ ایسے گم سُم کیوں ہو ؟"

یکایک وہ چونک جاتی۔

"جی ! ہاں، ہاں !! کیا کہہ رہی تھیں آپ ؟"

ممّی زور سے ہنس دیتیں۔

"پگلی ! کتنی بھولی ہے تو !"

اُنہیں خیال آتا ——— یہ زمانہ لڑکیوں کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے ! کچھ ہوش نہیں رہتا۔ سوتے جاگتے صرف خواب دیکھتی ہیں۔ تر تارہ جالوں میں پھنسی رہتی ہیں ——— پریوں کے دلیش میں سیر کرتی ہیں۔ کوئی حسین و خوبرو شہزادہ اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ معصوم نیلم ! میری پیاری بچّی !

امسال گرمیوں میں اُن کے بھائی جان آئے تو شکیل اور زینت کو بھی اُن کی ممّی نے بلا لیا۔ چند دنوں تک خوب گہما گہمی رہی۔ دو چار روز بعد بھائی جان اُکتا گئے۔ تفریح کے زیادہ شائق نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے میں جو وقت گزرتا اُسی کو زندگی کا حاصل سمجھتے۔ ایک صبح اُٹھے اور کالج روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ ممّی روکتی رہیں۔ نیلم نے منّتیں کیں۔ زینت نے قسمیں دلائیں۔ شکیل نے دوستی کا واسطہ دیا۔ لیکن بھائی جان کی ضد کیا رہی جو مان جاتے۔ یکایک ماحول سوگوار ہو گیا۔ شکیل بھائی اور زینت آپا بھی گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ممّی نے کہا سُنا۔

"نیلم بے چاری گھبرا جائے گی۔ تنہائی میں یونہی بے حال رہتی ہے۔ تمہارے ساتھ کچھ جی لگ گیا ہے اُس کا۔ اُس کی خاطر تو ٹھہر جاؤ!"

وہ لوگ بے بس ہو گئے ——————

نیلم کے چہرے پر رونق آ گئی ——————

ممّی کی طرح رضیہ آنٹی کے بھی دو بچّے تھے۔ شکیل جرنلزم پڑھ رہے تھے۔ زینت میٹرک کر چکی تھیں۔ اب اُن کی شادی کے پیغامات کا سلسلہ جاری تھا۔ پہلے بھی عموماً تعطیلات میں زینت اور شکیل خالہ جان کے یہاں آتے تھے۔ تقریبات میں اکثر کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ نیلم بھی آنٹی کی سہ منزلہ عمارت کے گوشے گوشے میں چوکڑیاں بھر چکی تھی۔ لان میں زینت آپا کی سہیلیوں کے ساتھ دوڑ کی بازی لگتی۔ کیاریوں سے گلاب توڑے جاتے۔ جوڑے سجتے۔ جوہی کے کُنج میں بیٹھ کر سرگوشیاں ہوتیں۔ شکیل بھائی نے نیلم کو دھمکیاں لگائی تھیں۔ شرارت سے اُس کی چوٹی پکڑ کر کھینچی تھی۔ اُس کی چیخ نکل جاتی۔ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے وہ آنٹی کے پاس

بھاگ جاتی۔ آنٹی سے شکیل بھائی کی شکایت کرتی۔ آنٹی شکیل کو ڈانٹتیں۔ شکیل کو وہ زبان نکال کر چڑا دیتی۔ اپنی جیت پر بہت خوش ہوتی۔

اِس بار شکیل نے پورے دو برس بعد نیلم کو دیکھا۔ اب وہ ننھی سی گڑیا نہ تھی۔ کلی پھول بننے کے لئے بیتاب تھی۔ اُس کے شوخ و نازک اعضا کی خوشبوئیں ماحول کو مہکا رہی تھیں۔ شکیل نے نیلم کے اِس رُوپ کا کبھی تصوّر بھی نہ کیا تھا۔ وہ اجنبی سی معلوم ہوئی۔ پہلے کی ساری دھینگا مُشتی وہ بھول گئے۔ انھوں نے نہ چپت لگائی، نہ چوٹی پکڑی، نہ دھکی ماری، حیرت و استعجاب سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ نُور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کوئی مجسّمہ معلوم ہو رہی تھی۔ نیلم ایک انجانے جذبے سے سرشار تھی۔ ایک شریر مُسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شفق کی سُرخیاں اُبھر آئیں۔ اب نیلم کے اُلجھے اُلجھے خیالوں کی ڈور میں شکیل بندھتے جا رہے تھے۔ سب کی نگاہوں سے بچ کر شکیل کی جانب وہ دیکھتی۔ کبھی دونوں کی آنکھیں مل جاتیں، نظریں ہم آغوش ہو جاتیں۔ عجب کسک سی وہ محسوس کرتی۔ ایک درد جاگ اُٹھتا۔ تنہائی میں شکیل کے سائے اُبھرنے لگتے۔ انگڑائیاں لیتے ہوئے اچانک ایسا محسوس ہوتا وہ آ ہی تو گئے! گھبرا کر وہ ہاتھ گرا دیتی۔ شرمائی لجائی کنواریاں کتنی حسین لگتی ہیں۔! وہ چاہتی شکیل اُس کا دامن تھام کر اپنی طرف کھینچیں۔ وہ تکرار کرے۔ وہ اصرار کریں۔ جب بات بنے تو وہ اُس کے کاندھے پر اپنا سر ٹکائے ہوں۔ اُن کی سانسوں کی حرارت سے وہ پگھل رہی ہو۔ اُس کی زُلفوں سے کھیلتے ہوئے دھیمے سے وہ اس کا ہاتھ تھام لیں اور کہیں ——

"مجھے تم سے محبت ہے! مجھے پناہ دو میری جان! تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا!" وہ یکایک اپنی سُبک سُبک اُنگلیاں اُن کے ہونٹوں پر رکھ دے۔ اور وہ فرطِ محبت سے اُس کا ہاتھ چوم لیں۔ ★

اُس رات کئی بار نیلم پر غنودگی چھائی لیکن نیند نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کروٹیں بدلتی جا رہی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کا نیلا بلب روشن تھا۔ برسات کی پھُواروں سے موسم خُنک ہو گیا تھا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آجاتے۔ بیلے کی بھینی بھینی خوشبو ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ سرہانے سے اُس نے کلائی کی گھڑی اُٹھائی۔ ایک بجنے میں چند سکنڈ باقی تھے۔ سونے کے لئے وہ پھر کوشش کرنے لگی۔ بے چینی میں آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔

اُس کے ذہن میں خیالوں کا ایسا لامتناہی سلسلہ تھا کہ وہاں نیند کے لئے سارے دروازے بند ہو چکے تھے۔ کوئی دریچہ تھا، نہ روزن۔ بستر پر شکنیں پڑتی رہیں۔ سامنے دوسرے پلنگ پر زینت آپا مزے میں سو رہی تھیں۔ نیلم بستر سے اُٹھی۔ ٹیبل کے اوپر سے پانی کا گلاس اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی۔ اُس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ زینت آپا خواب میں کسی سے ہمکلام تھیں۔ نیلم کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کئی چکر لگا ڈالے لیکن اضطراب کم نہ ہوا۔ وہ کمرے سے باہر آگئی۔ سناٹے میں بینڈکوں کے ترّانے کی آواز زندگی کا ثبوت دے رہی تھی۔ جھینگروں کی موسیقی بھی فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ دبے قدموں سے وہ آگے بڑھنے لگی۔ یہ ممّی کا کمرہ تھا۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ ڈیڈی باہر گئے تھے۔ اُن کا کمرہ مقفّل تھا۔ برآمدے سے گذرتے ہوئے قدم قدم پر وہ ٹھٹک گئی، جیسے وہ چوری کرنے جا رہی ہو اور پکڑے جانے کا خدشہ ہو۔ اُس کمرے میں شکیل سوئے تھے۔ نزدیک آکر اُس نے کواڑ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ نیلم نے کواڑ پر ہاتھ رکھا۔ چرچراہٹ کی آواز ہوئی۔ پھر نیلم کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ شکیل جاگ پڑے۔

"کون ہے؟" شکیل نے پکارا ——— "کون؟"

نیلم کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی۔ بستر پر اوندھے مُنہ گر پڑی اور ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگی۔

"ڈھنگ"

بھیڑ کے بیچ دُرجن سنگھ اپنے شکار پر ایسے ہی جھپٹا تھا جیسے کوئی مور سانپ پر جھپٹتا ہے۔

چھوٹے کو بھاگنے یا سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ اُس کا ہوشیاری سے بڑھتا ہوا ہاتھ ایک مضبوط شکنجے میں کس لیا گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ چھڑانا چاہا تو دُرجن نے اُس کی باہیں چڑھا دیں۔ اُس کی چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ بھیم سنگھ نے اُس کے مُنہ پر کس کر تھپّڑ مار دیا۔ اُس نے اپنے آپ کو ڈھیل دے دی۔ گلے میں پھنسے ہوئے بلغم کو زمین پر تھوکا تو وہ خون میں سنا ہوا تھا۔ اُس نے آستین میں ہونٹ رگڑے اور بیچارگی سے دُرجن کی طرف دیکھا۔

دُرجن کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اُس کی اینٹھی ہوئی نُکیلی مونچھیں اُوپر کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹ موٹے اور بھدّے تھے۔ اُس کے پپوٹے بھاری تھے۔ گالوں پر تھوڑی جھرّیاں تھیں۔ آنکھوں کے زیریں حلقے میں

پیچھے تھوڑے لٹکے ہوئے تھے۔

بھیم نے چھوٹے کے لمبے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر کھینچا اور اُسے ماں کی گالی دی۔

اُس کے چہرے پر درد کی لکیریں اُبھر آئیں۔

بھیم منحنی جسم کا آدمی تھا لیکن اُس کا چہرہ بارعب تھا۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بات بات میں گالیاں بکنے کا عادی تھا۔ ضرورت بے ضرورت گھونسوں، تھپڑوں کا استعمال فراخ دِلی سے کرتا تھا۔

میلے کی بھیڑ سے بے پرواہ دُرجن اور بھیم اپنے شکار سے نپٹ رہے تھے۔ یہ میلہ ہر سال دسہرہ کے موقع پر لگتا تھا۔ ہفتوں بھیڑ بھاڑ رہتی۔ آس پاس کے دیہاتوں سے جوق در جوق لوگ آتے۔ ان میں بچے بھی ہوتے، مرد اور عورتیں بھی۔ دُرگا ماتا کے درشن اور پان پھول کے چڑھاوے کے بعد میلہ گھومنے والے سرکس یا نوٹنکی دیکھتے، چڑیا گھر گھومتے یا چمپا کلی بیڑی کمپنی کے اسٹیج پر کولھے مٹکاتے ہوئے لونڈے کا نظارہ کرتے اور بیڑی کے کش لگاتے۔ گھر جاتے ہوئے میلے کے کچھ سوغات بھی خرید لیتے۔ عورتیں زیادہ تر سوت کی یا ریشم کی چوٹیاں خریدتیں یا پوڈر کا ڈبّہ۔ مرد چاقو یا گڑانسا خریدتے یا بیلوں کے گلے کی گھنٹی۔ بچے ٹین کی سیٹیاں پھُر پھُر کرتے پھرتے۔

میلے کے دِنوں میں پورے علاقے میں رونق چھا جاتی۔ گاؤں والیاں اپنے مردوں کو میلے جانے سے پہلے بہت بہت تاکید کرتیں کہ وہ کسبیوں کے محلّے میں نہیں جائیں گے۔ لیکن اس ممانعت سے دیہاتی مردوں کے تجسّس کو اور بھی ہوا ملتی اور وہ کسبیوں کو کوئی عجوبہ جان کر اُنہیں دیکھنے کا شوق لئے اُن کی کمین گاہوں سے ضرور گذرتے۔ اُن دنوں دُور دراز سے کسبیاں آتیں اور اُن کا دھندا خوب جمتا۔ دُرجن اور بھیم ان علاقوں کا بھی چکّر لگاتے اور عُقابی نگاہوں سے اپنا شکار ڈھونڈتے۔

اُس دن چھوٹے کی قسمت ہی خراب تھی۔ دن میں ہاتھ جما نہیں۔ اور شام سے لے کر اب تک اڑچنیں ہی گھیرے رہیں۔ اب جبکہ موقع ملا بھی تو انہونی ہو گئی۔ بھیم کے طمانچے نے اُس کے جبڑے ہلا دیئے تھے۔ دُرجن اُسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے کا وین "ہم دو، ہمارے دو" کا پرچار کرتا ہوا پاس سے گذر گیا۔ طلبہ کا ایک جتھا "جے پرکاش نرائن کی جے" اور "ودھان سبھا بھنگ کرو" کا نعرہ لگاتا ہوا قریب آ رہا تھا۔ بھیم چھوٹے کے کانوں میں کچھ پھُسپھُسایا۔ چھوٹے نے ہاتھ ہلا کر ہونٹ بچکائے۔ مزید اپنی خالی جیبیں اُلٹ دیں۔ بھیم نے اُسے اُلٹا جھانپڑ رسید کر دیا ہوتا، لیکن دُرجن نے اُسے ٹھوکے دیئے۔ نزدیک سے کچھ سفید کھدّر پوش 'سیوا آشرم' کے کیمپ کی جانب جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔

لاٹری کی ٹکٹیں بیچنے والے لاؤڈ اسپیکروں پر کرارے نوٹوں کی بارش کر رہے تھے اور اس طرح حکومت کی غریبی ہٹاؤ مہم کا تعاون کر رہے تھے۔ شور اتنا تھا کہ ٹھیک سے کچھ بھی سُنائی نہ دیتا تھا۔ دُرجن نے چھوٹے کے تمام جسم کو ٹٹول لیا۔ کپڑوں کی تلاشی لی اور ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔

بھیم پیچھے کی طرف جھکا، دُرجن سے آہستہ آہستہ کچھ کہا اور اپنی بائیں آنکھ داب کر مسکرایا۔ دُرجن کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ اُس نے سر ہلا دیا۔ پھر بھیم نے چھوٹے کے کندھوں کو تھام کر اُسے کچھ سمجھایا۔ چھوٹے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور ایسے سر ہلا دیا جیسے بھیم نے جو کچھ کہا ہو اُس سے اُسے اتفاق ہو۔

چھوٹے محکمۂ زراعت کے پیویلین کے عقب سے آکر 'جیون بیمہ' کے پرچار دبھاگ کی عقب سے نکلا اور بھیڑ میں گم ہو گیا۔ ڈرجن اور بھیم اُس کے پیچھے سائے کی طرح لگے رہے۔ چھوٹے اگر چاہتا بھی تو اُن کے چنگل سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اُن کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور پھر چھوٹے جانتا تھا کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بَیر نہیں کرنا چاہئے۔

تعلقات عامّہ والے پنڈال سے بجاؤ کے طریقے سمجھانے کے بعد ہندوستان کی اہم تیرتھ استھانوں والی فلم دکھارہے تھے۔۔ مجمع اتنا تھا کہ بدن سے بدن چھل رہا تھا۔ لوگ پوِتر مندروں کی مُورتیوں کو دیکھنے میں محو تھے۔ چھوٹے نے شنکر پاروتی کی مُورتی دیکھی تو عقیدت سے سر جُھکا دیا۔ ہاتھ جوڑ کر انھیں نمسکار کیا۔

کٹھ پُتلیوں والے انسان کے کرموں کے مُطابق دوزخ اور بہشت کی سَیر کرا رہے تھے۔ چھوٹے نے نرک کی باتیں سُنیں تو چند لمحوں کے لئے اُس پر دہشت طاری ہو گئی۔ پھر ٹیڑھے میڑھے شیشوں والے گھر میں اپنی لمبی ناک، پھُولے گال اور بڑے بڑے کانوں کو دیکھ کر اُسے بڑی زور کی ہنسی آئی۔

موت کے کنویں میں نقاب پوش موٹر سائیکل چلانے والے کی جواں ہمّتی سے چھوٹے بہت متاثر ہوا۔ کاش وہ بھی ایسا ہی کچھ کرتا ہوتا! اُسے اپنے آپ سے کراہیت ہوئی۔ نیچے جھانکتے ہوئے اُسے خیال آیا چھلانگ لگا کر گناہوں سے بھری اِس زندگی کا خاتمہ کر دے۔ یکایک اُس کی بھٹکتی نظروں نے بھیم کی بھیڑیے جیسی آنکھوں کو دیکھا جو قریب ہی اُس پر تاک لگائے ہوئی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر آگے بڑھ گیا۔

ہنڈولے پر عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ لال، ہری، پیلی بتّیاں جگمگ کر رہی تھیں۔ تھیٹر والا آج کے کھیل کے شروع ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ پردے کے بھیتر سے ڈھولک کی تھاپ اُبھر رہی تھی۔ ٹکٹ کی کھڑکی پر دھینگا مُشتی ہو رہی تھی۔

چوڑیوں کی دکانوں پر نوجوان مردوں کا جم غفیر تھا۔ گول، لمبے بیلون فروخت ہو رہے تھے۔ کھلونے والا کالے ریچھ میں چابی بھر کر سیاہ برقعے والی خاتون کو دکھا رہا تھا۔ اُن کی بغل میں کھڑا نٹ کھٹ بچہ دانت کھسوٹ رہا تھا۔ اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہا تھا۔

بجلی والے جھولے کی پرلی جانب چھوٹے آیا تو درجن اور بھیم بھی اُس کے سر پر جا پہنچے۔

"نکال بیٹا! دیکھ کتنی کمائی ہوئی؟"

درجن نے چھوٹے کی پیٹھ پر ایک دھول جمایا۔

چھوٹے نے اپنی مختلف جیبوں سے کچھ نوٹ اور ریزگاریاں نکالیں۔ دھیرے دھیرے بڑبڑایا —— "تین سو اکیاسی روپے، باون پیسے۔"

"شاباش! بیٹا! تو اب جا"۔ بھیم نے اُس کے ہاتھ سے کئی پیسے جھپٹ لئے۔

چھوٹے نے بھیم کی مٹھیوں کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ہوئے آہستہ سے بولا —— "حوالدار جی! مجھے کچھ نہیں؟"

"ابے سالے! جا جا!"

"ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔ اپنی تقدیر بنالے۔"

"چل بھاگ۔"

"چل چھوٹے۔"

جاتے جاتے اچانک چھوٹے نے چاہا کہ وہ اُن دونوں کے منہ پر تھوکتا جائے۔ لیکن درجن اور بھیم کی خاکی وردیاں اور سرخ ٹوپیاں اُسکی ہمت پست کر گئیں۔

"کس لئے"

ٹن ، ٹن ، ٹن .... ٹن !

ایک سے بارہ تک گھنٹے گننے کے بعد شیام سُندر نے گردن گھُما کر پہلے دیوار کی گھڑی کی طرف دیکھا، پھر تکیہ کے نیچے دھری پاکٹ گھڑی نکالی۔ دونوں گھڑیوں کے اوقات میں چار منٹوں کا فرق تھا۔ تازہ رسائل سرہانے سے ہٹا کر اُس نے تپائی پر رکھ دیا۔

دیپ کے آنے کی آہٹ اب تک نہیں ملی تھی۔

شیکھا کے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔

کھُلی کھڑکی سے ہوا کی ایک لہر آئی۔ دیوار پر ٹنگے کلنڈر کے اوراق پھڑپھڑائے۔ یکایک شیام سُندر کو بڑھی ہوئی خُنکی کا احساس ہوا۔ پائنتی رکھی ہوئی اُونی چادر اُس نے پیروں سے سینے پر کھینچ ڈالی۔ اُسے کھانسی آئی۔ اُس نے گلابند ٹھیک سے لپیٹا۔ زیرو بلب جل رہا تھا۔ مدھم نیلی روشنی کمرے کی ساری چیزوں پر پھیلی تھی۔

گھڑی ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ دیوار پر فریم میں گاندھی، نہرو اور آزاد کی تصویریں تھیں۔ کارنس پر ایک جانب اُس کی جوانی کی تصویر تھی۔ دوسری طرف وہ اور یشودھا ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ایک اور خاندانی گروپ فوٹو تھا ـــــــ انوپ، بہو، دیپ، شیکھا اور بیچ میں وہ خود۔

میز پر تہہ کیا ہوا اخبار ہوا سے اُڑ کر بغل کی کُرسی پر جا پڑا۔ شیام سُندر نے اخبار اُٹھا کر میز پر رکھا اور اُسے شیشے کے پیپر ویٹ سے دبا دیا، تاکہ پھر یہ اپنی جگہ سے بے جگہ نہ ہو۔

اُس کی میز پر اُس کے استعمال کی چیزیں سلیقہ سے سجی رہتی تھیں۔ یہ چشمہ، یہ قلم، یہ ڈائری، یہ نیوار کی ڈِبیا اور وہ اُس کے زیرِ مطالعہ کتابیں......

شیام سُندر کی عُمر اَسّی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اُس کی کمر جُھکی نہیں، لیکن اُس کی صحت اب اچھی نہیں رہتی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ چل چلاؤ کا وقت ہے۔ کسی بھی گھڑی سانسوں کی ڈور ٹوٹ سکتی ہے۔ لیکن شیکھا اُس کی گردن میں جھول کر کہتی ـــــــ

"مائی ڈیئر دادا جی! ایک صدی پوری کیے بغیر آپ کو نہیں مرنا ہے ـــــــ جسٹ اے سینچری پلیز!"

کبھی کبھار جوڑوں کے درد میں مُبتلا ہو کر بستر میں قید ہو جانا پڑتا۔ تب اُس کی دلچسپی سمٹ کر صرف سیاست، سیاحت، تاریخ کی کتابوں اور روزناموں تک آ جاتی۔

اَنوپ کو تجارتی کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ کبھی اِس شہر، کبھی اُس شہر، کبھی لندن، کبھی بیروت ـــ دیپ، یونیورسٹی پالیٹکس میں تھا۔ کبھی بند، کبھی ہڑتالیں۔ شیکھا آئے دن کلچرل پروگراموں کی تیاری میں رہتی۔ کبھی بھارت ناٹیم، کبھی کتھا کلی۔ بہو کتنی دیر اُس کے پاس بیٹھتی۔

یشودھا کو مرے چھتیس سال بیتے، یعنی کُل تین یُگ ـــ اب بھی شیام سُندر کو

اُس کی یاد ستاتی۔ جیل کے دنوں میں یشودھا سے دُور اُسے بڑی تڑپ ہوتی تھی۔
سرکار کی طرف سے مہینہ میں ایک بار صرف آدھ گھنٹہ کے لئے ملاقات کی اجازت ملتی۔
محافظ کے رُو برُو کھُل کر باتیں کیا ہو پاتیں، آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوتے۔
وقت ختم ہوتا تو جذبات سے مغلوب ہو کر شیام سُندر اُس کے ہاتھ پکڑ لیتا۔ کہتا ——
"دھیرج رکھنا .... میری راہ دیکھنا .... وطن کی لڑائی سے
فتح یاب لوٹوں گا۔"
ڈبڈبائی آنکھوں، لرزتے ہونٹوں سے وہ کہتی ——
"میں انتظار کروں گی ...."
یشودھا کافی بیمار ہو کر مری تھی، کھُل گھُل کر ——
انُوپ نے جیل کی سلاخوں کو پکڑے پکڑے اُسے یہ منحوس خبر سُنائی تھی۔ شیام سُندر
کے گالوں پر آنسو لڑھک پڑے تھے۔ انوپ خود بھی پھپھک پھپھک کر رو دیا تھا۔
شیام سُندر کو اِن دنوں نیند کم آتی۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے غنودگی
طاری ہوتی۔ گہری نیند جو نوجوانی میں آتی تھی میسّر نہیں۔ آنکھیں بند کئے کئے وہ
کتنی ساری باتیں سوچ ڈالتا۔ کبھی بچپن کے دوست یاد آتے، کبھی جوانی کی مشقتیں یاد
آتیں۔ کبھی کبھی موت کے بارے میں بھی سوچتا۔ دوسرے جنم اور نجات کے متعلق سر زنش
کرتا۔ موقع مل جاتا تو گیتا پاٹھ کرتا۔ شری کرشن کے اُپدیشوں کو ذہن نشیں کرنے کی
کوشش کرتا۔
کوئی ایشیائی، افریقی یا لاطینی امریکی مُلک سامراج کے چنگل سے نکلتا تو اُسے
بے پناہ مسرّت ہوتی۔ جانباز شہیدوں سے اُسے بڑی عقیدت تھی۔
آچاریہ رجنیش کی تصنیفات کا وہ دل سے مداح تھا۔ پچھلی گرمیوں میں وہ سوامی
مُکتانند سے بھی مِلا تھا۔ اُن سے آشیرواد لی تھی۔ یوگ اور تنتر میں اُس کا گہرا وشواس تھا۔

عرصہ سے ہر سال دو سال پر اپنے پرانے رفیق سیّد کے ساتھ وہ اجمیر شریف جاتا۔ خواجہ صاحب کے مزار پر حاضری دیتا۔ پھول چڑھاتا۔ منتیں مانتا۔ مجاور کو نذرانے دیتا۔

سالِ رواں کے اوائل میں اُسے راجدھانی جانا پڑا تھا۔ دیپ اور شیکھا بھی ساتھ گئے تھے اُس کی سیاسی خدمات کے اعتراف کے طور پر راشٹرپتی نے اُسے تامرپتر عنایت کیا تھا۔ اُسے آزادی کی لڑائی یاد آئی۔ جیل کی سختیاں، گولیاں، لاٹھیوں کی بوچھاڑ آزادی کے جیالوں کو پیچھے نہیں ڈھکیل سکی تھیں۔

شیام سُندر نے کروٹ بدلی۔

پلنگ کی چولیں چرچرائیں۔ اُس نے پاؤں سمیٹے۔ اُس کے کولھوں میں پھر درد اُبھر آیا تھا۔ پنڈلیاں بھی دُکھ رہی تھیں۔ اُس نے اپنی انگلیوں سے پنڈلیاں ہلکے ہلکے دبائیں۔ راحت ملی۔

اُس کے ہاتھوں میں پہلا سا زور اب نہیں رہا تھا۔ پٹھے پلپلے پلپلے ہو گئے تھے دانت ٹوٹتے جا رہے تھے۔ مُنہ پوپلا ہو گیا تھا۔ شیکھا کی سہیلیاں اُسے دیکھ کر خوب ہنستیں۔ حجامت کے وقت آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر اُسے بھی ہنسی آ جاتی۔ چہرہ پر جھرّیوں کا جال پھیل گیا تھا۔

دیپ جب کبھی کھُل کر ہنستا تو اُس کی طرف جھُک کر آہستہ سے کہتا۔

"داداجی! ہندوستان کے سارے مسئلے آپ کے گالوں پر سمٹ آئے ہیں!"

وہ زور سے قہقہہ لگاتا۔

کبھی کبھی اُسے دیپ کی باتیں الجھی ہوئی لگتیں. دیپ ہوا میں مُکّے لہرا لہرا کر چلاتا.

"آزادی ہمیں بھیک میں مل گئی. گوروں کی بھیک. پہلے اپنی جھولی اس بھیک سے آپ نے بھری. پھر یہی بھیک ہماری جھولی میں ڈالدی ہم پر بڑا احسان کیا."

شیام سُندر ملول ہو جاتا. اُسے سمجھاتا.

"برخوردار! ہماری آزادی گوروں کی بھیک نہ تھی. ہم نے اس کے لئے قربانیاں دی تھیں. جانیں لُٹوائی تھیں، اپنے پرائے چھوڑے تھے گھربار تیاگا تھا..."

دیپ بات اُچک لیتا.

"میں آپ کی بات نہیں کر رہا....."

"پھر؟"

خونی آنکھوں والے یہ گدھ ہمارے سروں پر کیوں منڈلا رہے ہیں؟ ہم انہیں بھون ڈالیں گے. ہم اِسٹیب لشمنٹ کے پرخچے اڑا دیں گے..."

شیام سُندر کو شدید اُلجھن ہوتی. کچھ بھی نہیں سمجھ پاتا.

وہ سوچتا یہ نئے لوگ ہیں....... وہ بھی تو اپنے زمانے میں نئے تھے...... ایسی ہی بہکی بہکی جوشیلی باتیں کرتے تھے...

انوپ سے باتیں کم ہوتیں.

"طبیعت کیسی ہے؟"

"گلوکوز لیا تھا؟"

"ڈاکٹر دیو آج آپ کا چیک اپ کریں گے....."

شیام سُندر کو اُس کے سارے مہیے ٹیلی فون پر ملتے۔ شاذ و نادر ہی اُس سے ملاقات ہوتی۔

انوپ بہت سارے خیراتی اداروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ شیام سُندر کو خوشی ہوتی۔ کسی امیر کی دولت میں غریبوں کا بھی حصّہ ہوتا ہے اُن کے حق سے انہیں محروم رکھا جائے تو ایشور ناخوش ہوتا ہے.....

انوپ کے ٹھاٹھ دیکھ کر اُسے لگتا۔ جیسے ہندوستان نے کافی ترقی کر لی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی ہے جیسے کہ اُس کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی ہو۔

★

وہ بھی عجیب سا دن تھا۔

شیکھا کل ہند مقابلہ حُسن میں اوّل آئی تھی۔ بہت چہک رہی تھی۔ اُسے شیام سُندر کی دقیانوسیت پر بھی ہنسی آرہی تھی ــــــ ہنسی کے دہکتے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے اُس نے اٹھلا کر کہا ــــــ

"یہ تو ہمیشہ دو صدی پیچھے رہتے ہیں۔ کہنے لگے ـــ خوبصورتی بھلا دکھانے کی چیز ہوتی ہے! منہ پھلائے بیٹھے ہیں۔ آخر داد بھی نہیں دیا۔ یُور دادا جی!"

وہاں دیپ بھی نہیں تھا کہ شیکھا کی طرفداری کرتا۔ دادا جی کو منا لیتا۔

دیپ کا امتحان چل رہا تھا۔

دوپہر میں احتشام نے اطلاع دی کہ چونکہ سوالات ڈفی کلٹ اور ان یوژوال تھے۔ اس لئے سب نے امتحان کا بائیکاٹ کر دیا۔ وی سی کا گھیراؤ کیا، انہیں پیٹا ـــــ کیمپس میں گاندھی جی کی سنگی مورتی توڑ ڈالی گئی ــــ آفس اور لائبریری جلا دی گئیں۔ دیپ پولس حراست میں

ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ یونین زبردست ایکشن لے رہی ہے..... ممکن ہے ہم بدلے کی کارروائی بھی کریں۔"

شیکھا نے مچل کر تالی بجائی۔

"آور لیڈر از گریٹ!"

شیام سندر کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ اُس نے چہرہ پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو تولیہ میں جذب کیا۔

ٹھیک اُسی گھڑی سی بی، آئی والوں کا ٹیلی فون آیا۔

"انوپ کمار گپتا فیما کے تحت اسمگلنگ کے جُرم میں گرفتار کر لئے گئے ہیں۔"

شیکھا نے چونک کر پوچھا۔

"وہاٹ؟"

شیام سُندر کے دماغ میں متعدد سوالیہ نشانات تھے۔

آج پہلی بار اپنی زندگی کے لاحاصل رہ جانے پر اُسے افسوس ہو رہا تھا۔

★★

چوری

صبح سویرے ہی عائشہ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"او، گھوڑے بیچ کر سونے والے ــــ آنکھیں کھولو، زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ تمہاری نیند پر اللہ کی مار ــــ ہم تو لٹ گئے، برباد ہو گئے۔"

ہمیشہ کی طرح آنکھیں بچھیا کر میں نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹک دینا چاہا۔ وہی فجر کی نماز پڑھنے سے گھر میں برکت ہوتی ہے، کا ورد ہو گا۔

میں نے آنکھیں بند کئے کئے کروٹ بدلی۔

"خدا کی بندی! تم جاؤ اور شوق سے نماز پڑھو۔ ناحق مجھ گنہگار کے چکر میں پڑتی ہو۔"

رات دیر تک جاگ کر میں نے دفتر کا ادھورا کام مکمل کیا تھا۔ زیادہ سگریٹ پینے سے حلق جل رہا تھا۔

"بھلے آدمی! وہ تقریباً چیخ پڑی ــ اٹھو اور گھر کی خبر لو۔ پولس کو بلاؤ۔ پچھلی رات اِس گھر میں کوئی چور گھس آیا تھا۔"

اُدھر اُس کا جملہ پورا ہوا، اِدھر میں اُچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ تکیہ دھپ سے زمین پر گرا۔ سرہانے رکھی ہوئی کتاب تکیہ پر گری۔ میں نے آنکھیں ملیں۔

عائشہ نے سر سے گرے ہوئے آنچل کو سر پہ جماتے ہوئے میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں شوخی کم تھی۔ بدحواسی زیادہ تھی اُس کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ اُس کے بال اُلجھے اُلجھے سے لگے۔ اُس نے ہاتھ میں کُنجیوں کا جھبّہ سنبھال رکھا تھا۔ اُس کے قدموں تلے جھاڑو پڑا تھا۔

"رات جس دروازہ کو دیکھ بھال کر بند کیا تھا سویرے اُس کے دونوں پٹ کُھلے ہوئے ہیں۔"

"کون سا دروازہ؟"

"باورچی خانہ کا۔"

"اپنا خزانہ دیکھا —— ؟ وہ تو بازو والے کمرے میں ہے!"

میرا اشارہ اُس کے زیورات کے بکس کی طرف تھا۔

"ہاں! وہ ٹھیک ہے۔"

وہ کُنجیوں کو گویا شمار کرتے ہوئے بولی۔

"اپنے بکسوں کو تو گنو —— کُنجیاں بعد میں گن لینا۔"

میں نے سرہانے سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا اُٹھائی۔

"گن چکی ہوں۔ اب تم بھی تو حساب ملا لو۔ مجھ سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔"

میں نے بُجھی ہوئی تیلی فرش پر پھینک دی۔

"ممکن ہے باورچی خانہ کا دروازہ تم نے بند ہی نہ کیا ہو یا پھر پچھلے پہر اُٹھ کر کھولا ہو۔ بعد میں سو گئی ہو۔"

اُس نے بچھاون پر مُنّے کی بانہیں سیدھی کیں۔ مُنّے کی ٹانگوں پر چادر کھینچ دی۔

"ہونہہ ...... ! اتنی بھلکڑ ہوں اور نہ ہی خواب میں اٹھ کر چلتی پھرتی ہوں"۔
اُس نے پھر ڈیکوں کی جھلملی لپیٹ دی۔ گوشے میں دُبکی ہوئی ایک چھوٹی دُم کٹی چھپکلی سر سراد پر دیوار پر رینگ گئی۔
"اوئی! کہتے ہوئے عائشہ نے دیدے نچائے۔ اُس نے ایسے منہ بنایا جیسے اُسے اُبکائی آئی ہو۔
میں نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور جلتا ہوا ٹکڑا آنگن میں پھینکدیا۔ دھوپ آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی۔ میں نے انگڑائی لی۔ اور عائشہ کو لپک کر پکڑ لینا چاہا۔ اُس نے منہ گھما لیا۔
"ہٹو! یہ بھی کوئی مذاق کا وقت ہے۔ اللہ سے ڈرو ..... سویرے سویرے تم تو کبھی سنجیدہ نہ ہو گے .... رات گھر میں چور گھس آیا تھا۔ کیا لے گیا۔ کیا چھوڑ گیا دیکھنا چاہیئے تو ...."
اُس نے مجھے گھورا۔ ناک سکوڑ لیا۔
"کیا کروں میں؟ تھانے دار سے ملوں؟"
"پہلے گھر کا سامان ملالیں۔۔۔ نقصان کا اندازہ تو ہو جائے، کیا گیا، کیا بچا؟"
"خیر! کہاں سے شروع کروں؟"
میں نے اپنی صورت پر مسکینی طاری کر لی۔
"بیوی ایک عدد ــــ زندہ سلامت۔ بچے دو عدد۔ موجود۔ خاندانی منصوبہ بندی کے نئے نعرے کی لاج بچ گئی۔ شوہرِ نامراد صحیح سالم۔ ناچیز، حاضر ہے .....!"

عائشہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دھیرے دھیرے کچل رہی تھی۔ چھوٹتی ہوئی ہنسی کو روکے ہوئی تھی۔ بھویں بھی سکڑتی جارہی تھیں۔

"پھر وہی کھلنڈرا پن"

وہ کھسیانی ہوگئی۔

"دو، دو بچوں کے باپ ہو۔ عمر کا بھی تو لحاظ کرو۔ چلو، کھونٹی پر اپنے کپڑے دیکھو۔ کوٹ دو، پتلون پانچ۔ پاجامہ چار، قمیص......"

عائشہ کے پیچھے پیچھے گھوم گھوم کر، میں نے باہر پھیلے ہوئے اپنے، اُس کے اور بچوں کے کپڑوں کی فہرست مرتب کیا۔ ٹرنک سے کپڑے نکالے اور جمع تفریق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ کپڑے چوری نہیں ہوئے۔ پھر ہم نے جوتے، سینڈل اور چپلیں گنیں۔ وہ بھی گنتی میں پورے نکلے۔ سوٹ کیس، بریف کیس، اسٹیل بکس۔ وہ بھی ٹھیک۔ دیوار گھڑی اپنی جگہ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ ہماری کلائی کی گھڑیاں بھی محفوظ تھیں۔ تانبے کی دیگچیاں، اسٹین لیس پلیٹیں، پیالے، درست لنگیاں، گنجیاں، ساڑیاں، دستیاں، چولیاں۔ ایک ایک موجود۔ شیشے کے گلاس، المونیم کا لوٹا۔ پھولوں کے گلدستے۔ اپنی اپنی جگہ پر۔ مرکری ٹیوب برآمدے میں سوواٹ کا بجلی کا بلب۔۔۔ کیل کانٹے سے ٹھیک ہوئے۔

میں تھک ہار کر غسل خانہ میں چلا گیا۔ برش کیا۔ نہانے سے تھکان دور ہوئی۔ ذہن کو تازگی ملی۔ آسمان میں یکایک بادل گھر آئے تھے۔ بار بار بجلی کڑک جاتی تھی۔ عائشہ چولھا جھاڑ رہی تھی۔ مُنّے اور بنّے اب تک سوئے ہوئے تھے عائشہ کی بڑبڑاہٹ مسلسل سُنائی دے رہی تھی۔ یقیناً وہ سب کچھ مجھے

سُنانے کے لئے ہی بول رہی تھی۔

"رات سوتے میں میں نے کھٹ پٹ سُنی تھی۔ سوچا بِلّی ہوگی۔ بلّی کیوں ہونے لگی! چور نہیں تھا۔ تو کوئی جن ہوگا!۔۔۔ لو، اِس گھر پر اب آسیب کا سایہ بھی ہوگیا۔"

"خواہ مخواہ وہم کا شکار کیوں ہوتی ہو؟ ناشتہ ملے گا؟"

میں نے اپنے بھیگے بالوں میں کنگھا کیا اور ٹوٹے ہوئے بالوں کو کنگھے سے الگ کرنے لگا۔

"لو، یہ وہم ہے!۔۔۔ ہونہہ اب باسی روٹیاں کھاؤ گے نا؟ سالن بھی رات والی ہے۔"

"جو بھی ملے"

"اچھا ٹھہرو۔"

چند لمحوں کے بعد عائشہ باورچی خانہ سے چیختی ہوئی باہر نکل آئی۔

"تم نہیں مانتے تھے نا۔۔۔ دیکھ لو۔ چور ہی تھا۔ نعمت خانہ میں تین روٹیاں رکھی تھیں۔ غائب ہیں۔ سالن کی طشتری خالی پڑی ہے۔ بھیٹو تھا کوئی۔ سب چٹ کر گیا۔ بھوک ہی لگی تھی تو اللہ کے نام پر دروازہ پہ ہانک لگاتا۔ کیا میں اُسے واپس کر دیتی؟...... نہیں اُف! گھروں میں سے روٹیاں بھی چوری ہونے لگیں! کیسا زمانہ آگیا ہے۔۔۔! خدا کی لعنت!...... قیامت قریب ہے!"

عائشہ کیا سچ مچ کسی وہم کا شکار ہو گئی تھی؟

یا میں ہی قائل نہیں ہونا چاہتا تھا۔؟

بہرحال میں نے اُسے تازہ روٹیاں پکانے کے لئے کہا۔ کپڑے تبدیل

کئے۔ جُوتے کے فیتے باندھتے وقت میں نے اس کی آواز پھر سُنی۔ کہہ رہی تھی۔

"عجیب چوُر تھا؟ ڈھیٹ کہیں کا!"

میں نے صحن سے اُسے پکار کر جلدی کرنے کی تاکید کی۔

برآمدے کی جانب مڑتے ہوئے ایک بار مجھے خیال آیا کہ نالی کی طرف دیوار کافی نیچی ہے ـــــ باہر سے پھلانگ کر کوئی بھی آسانی سے اندر آسکتا ہے ـــــ

٭

آج بھی

ایک بار پھر سُکھیا نے راجہ کو کلیجے سے چمٹا لیا۔ بے تحاشہ چومتی رہی۔ اس کے گالوں پر بہے ہوئے آنسو کے قطروں نے راجہ کے جسم کو بھی بھگو دیا۔ راجہ کی مٹھیاں بند تھیں۔ اُس کی ٹانگیں سوکھ گئی تھیں۔ اُس کے ٹخنوں میں سکھیا نے تانبے کے تار کا کڑا پہنا رکھا تھا۔ اس کی کمر میں کوڑیوں کی مالا تھی۔ راجہ کا سینہ دھنسا ہوا تھا۔ پیٹ آگے نکل گیا تھا۔ سکھیا کی طرح وہ بھی سیاہ فام تھا۔

راجہ کے گلے میں چمڑے کے خول میں لپٹا ہوا ایک جنتر لٹک رہا تھا جسے پیپل والے بابا نے دیا تھا...... بانہوں میں راجہ کو لیے ہوئے سکھیا بابا کے قدموں پر گر پڑی تھی۔ بابا نے اُس کے سر پہ دُلار سے ہاتھ پھیرا تھا اور بُد بُدا کر راجہ پہ پھونک ماری تھی۔ راجہ نے ٹھمک کر بابا کی داڑھی کھینچ لی تھی۔

"بم شنکر! بولے بم!"

سُکھیا کے سر پہ چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے ٹوٹے منڈیروں سے اُڑتے اور برگد کی کمھلائی شاخوں پر جا بیٹھتے۔ برگد کی ایک شاخ سے نیم کی ڈالیاں پھوٹ پڑی تھیں۔ کہیں سے اُڑتا ہوا ایک طوطا نیم کی اُوپر والی ڈالی پہ جا بیٹھا تھا۔ اب ٹرّا رہا تھا۔

سُکھیا نے اُوپر نگاہ کی۔ اُسے لگا جیسے طوطا اُسی سے مخاطب ہو۔ کوّے

بھی اُسی سے بول رہے ہوں۔

"راجہ بیٹیا۔ میرے راجہ!"

جیسے سوئے راجہ کو جگانا چاہتے ہوں۔ سُکھیا نہیں چاہتی تھی کہ راجہ کی نیند کھُلے۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کے جاگ اٹھنے سے پہلے ہی سب کچھ ہو جائے۔ پھُرتی پھُرتی وہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے ہاتھوں کی طاقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ اُس کے پیر بھی شل تھے۔

اس کے تلوے پھٹے ہوئے تھے۔ انگلیوں کی جڑیں مڑنے لگی تھیں۔ بڑے بڑے ناخنوں میں مٹی بھری تھی۔ اُس کے بال اُلجھے تھے۔ گردن پر میل کی پرتیں جم گئی تھیں۔ اُس کے دونوں کانوں کی لویں کٹی ہوئی تھیں۔

.....انہیں کانوں میں پہلے چاندی کی بالیاں لٹکتی تھیں۔ وہ بالیاں اُس کی شادی کی نشانیاں تھیں۔ جبھی کی یہ نشانیاں تھیں اُسی کے کام آ گئیں۔ اُسے ہیضہ ہو گیا تھا۔ فیس کے نام پر ڈاکٹر بابو کی پھیلی ہوئی ہتھیلی میں بالیاں سکھیا نے دھر دی تھیں۔ وہ تو چاہنے پر بھی نہ ہو سکا تھا.....

سکھیا جہاں کھڑی تھی وہاں سے ندی کا ڈھلان شروع ہوتا تھا۔ ندی کے اُس پار کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ندی خشک تھی۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ دھرتی میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ کہیں کہیں سوکھی گھانسوں کی نشانیاں پھیلی تھیں۔

.....ان کھیتوں میں کبھی ہرے بھرے پودے لہلہاتے تھے۔ دوسری عورتوں کے ساتھ سُکھیا نے بھی بارش میں بھیگ بھیگ کر، کیچڑ میں لت پت ہو کر یہ پودے بوئے تھے۔ سوہنی کرتے وقت جھوم جھوم کر لہک لہک کر گیت گایا تھا.....

تب کی بات اور تھی. آج سُکھیا کی طرح یہ زمین بھی پیاس سے بیاکُل تھی. تیز تیز سانس لیکر جس طرح سُکھیا ہانپتی، اُسی طرح زوردار ہوا کے جھکڑ چلنے سے سوکھے پیڑوں کی ڈالیاں ہانپ جاتیں.

علاقے کی گائیں. بھینسیں سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھیں. کھیپ کی کھیپ روزانہ مر رہی تھیں. کانٹا تو سُکھیا کے حلق میں بھی چبھتا تھا. اُس کے پیٹ میں بھی اور چلتی تو راہ میں پڑا کوئی کنکر پیروں میں ایسے ہی چُبھتا جیسے کہ بیر یا ببول کا کانٹا چبھ گیا ہو. اُف کرکے رہ جاتی. چہرہ پر اینٹھن سی ہوتی. تلملا جاتی. کراہ اٹھتی.

سُکھیا کے جسم پر برسوں پرانی میلی کچیلی ایک دھوتی تھی جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی. پھٹے حصّے سے اُس کی کالی کالی رانیں جھلک رہی تھیں. اس کی چھاتیاں ڈھلک گئی تھیں. پنجرٹی ہوئی لگ رہی تھیں. راجہ اگر بلکنے لگے تو سکھیا اپنی چھاتیاں اُس کے منہ میں ڈال دے گی. راجہ انہیں داب کر چوستا رہ جائے گا. دودھ کا ایک قطرہ بھی اُس کے کنٹھ میں نہیں ٹپکے گا.

سُکھیا آہستہ آہستہ اپنے بھدّے ہونٹ راجہ کے گالوں پر رگڑتی رہی. اُس کی پیشانی چوم چاٹ کر صاف کیا. اپنی ہتھیلوں سے اُس کی بانہیں سہلائیں. اُس کے پیٹ کو اپنی تھوڑی سے چھُو دیا. اُس کے جسم کو سونگھتی رہی. اُس کے بدن کی مہک بڑی سوندھی سوندھی لگی.

شام ہولے ہولے اُتر رہی تھی. کہیں دُور کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی. دُور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا. سُکھیا کو اپنے دل کی دھمک صاف سنائی دے رہی تھی. اُس کے پیروں میں قوت نہ رہی تھی. اپنے بازوؤں میں بھی ناتوانی محسوس

کر رہی تھی۔ کہیں راجہ اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا تو؟

چراغ جلنے کا وقت ہو چکا تھا لیکن کہیں کوئی دِیا نہ جلا تھا۔ جھونپڑوں میں اب تک دُھواں بھی پھیل جانا چاہیئے تھا لیکن کہیں کوئی دھواں نہ تھا مندر میں گھنٹے بھی نہیں بج رہے تھے۔ پجاری کے منتروں کی چاپ بھی نہیں اُبھر رہی تھی۔

"شری رام چندر جی کی جے!"

چوپالوں میں کوئی ہنسی نہ تھی۔ کوئی کہانی نہیں ــــ کھُل جا سم سم، گُل بکاؤلی اور نہ ہی چندر کانتا ــــ البتہ کہیں کہیں سے مویشیوں کے ڈکارنے کی آواز آجاتی اور بچوں کے بلکنے کی۔

سارے گاؤں پر گہری اُداسی چھائی تھی۔ افق پر گہری سُرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ساری آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھتیں اور جُھک جاتیں۔ کوئی کسی سے نگاہیں نہیں مِلا پاتا۔ کچھ تھا جو سب ایک دوسرے سے چھُپانا چاہتے۔ سوچتے پر کہہ نہ پاتے۔

"ہے بھگوان! ..... کیا ہوگا؟"

تمام چہرے مُرجھائے ہوئے تھے۔ آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں زمانہ دیکھے ہوئے لوگ ماتھے پر ہاتھ رکھے سوچ میں غرق رہتے۔ نوجوان سینے پر ہاتھ باندھے بے نکان ٹہلتے جاتے۔ عورتیں یاس بھری نگاہوں سے اپنی گود میں دبکے ہوئے بچوں کو دیکھا کرتیں۔ بچے جب سسکتے تو وہ اُنہیں تھپکیاں دیتیں۔

"چندا ماما آ، مُنّے کو کِھلا، سونے کے کٹورے میں...."

اب تو اناج کے دانے رہے نہ درختوں کی سر سبز شاخیں، نہ گھاس نہ پات، کھیتوں، کھلیہانوں سے اِکّا دُکّا چُنے گئے دانے پیس پیس کر، کنوئیں کے گدلے پانی میں گھول کر سُکھیا خود پیتی تھی، راجہ کو پلاتی تھی۔ بہت چلّاتا چیختا تو اُس کے مُنہ میں اپنی چھاتیاں دھرا دیتی۔

سرِ شام ہی کسی سمت سے اُلّو کے بولنے کی آواز اُبھری تھی۔ سُکھیا نے پھٹی آنکھوں سے راجہ کو دیکھا۔ اُس کے ہونٹ کُھلے تھے۔ رال بہہ آئی تھی، اوپر کے دو دانت دکھائی پڑ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ اُس کی سانسوں کی مدھم مدھم آواز سُنائی پڑ رہی تھی۔ سُکھیا نے آہستہ سے راجہ کی مُٹھیاں کھولیں۔ اُس کی ہتھیلیوں پر اپنے ہونٹوں سے سہلایا۔ ہتھیلیاں ٹھنڈی تھیں ہونٹ بلبلے تھے۔

آسمان کی دُھندلاہٹوں میں چاند اُوپر اُوپر کھسک رہا تھا۔ اِدھر اُدھر ستارے بھی اُگ آئے تھے۔ سامنے گرُو جی کا پاٹھ شالہ تھا۔ اُدھر مُکھیا جی کا کھلیہان اُس کے پرے گاندھی جی کی مورتی، پنچایت، کچہری۔ سُکھیا کے پیچھے لکڑی کا پُل تھا۔ اُس کے آگے نوبت پور سے باہر جانے کی پگڈنڈی، پتلی ٹیڑھی میڑھی، سانپ کی طرح بل کھاتی۔

سُکھیا نے راجہ کے تمام جسم کو چوم ڈالا، اُسے بھینچ بھینچ کر پیار کیا ڈگمگاتے ہوئے چل کر پردھان جی کے گھر کے پیچھے کے کھنڈر میں شیو لنگ کے پاس آئی۔ راجہ کو زمین پر لِٹا دیا۔ پتلی، جھٹکی، دھندلی روشنی میں

پگڈنڈی کی طرف بڑھ گئی۔

سامنے سے ایک گیدڑ دوڑ کر ٹیلے کے پیچھے چلا گیا۔

گڈھے کے پاس شیشم کا پیڑ کبھی جن کی طرح کھڑا تھا ــــ

★

یہ کہانی نئی بھی ہے، پرانی بھی۔

سکھیا زندہ ہے یا مر گئی؟

راجہ جیا یا مرا؟

ہمیں اِن ساری باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔

ہاں، آج بھی یہ پہیلی سلجھائے نہیں سلجھتی کہ سکھیا راجہ کو خود سے الگ کیوں چھوڑ گئی ــــ اپنی خاطر یا راجہ کی خاطر؟ ــــ

کب تک

دونوں کو ہی اُمید تھی کہ ماں کا خط آج ملے گا۔ نہیں ملا تو تشویش ہوئی
اُس پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ غصّہ بھی آیا ــــ ایسا ہی کرتی ہے۔ جھوٹی! دو مہینے بیتے
آئی نہیں، بُلایا بھی نہیں۔ چھٹیوں میں پیاری پیاری باتیں لکھ بھیجتی ہے۔ بس!
صرف تاکیدیں! جی میں آتا ہے وہ سب کیا جائے جس کے لئے منع کرتی ہے
وہ سب نہ کیا جائے، جو وہ چاہتی ہے۔

.... ریما آج پھر آئس کریم کھائے گی ــــ گھنٹہ بھر بعد بولے گی تو آواز نہ
نکلے گی ــــ سائیں، سائیں! گلا دُکھے گا۔ کھانستے کھانستے آنکھیں اُبل پڑیں گی۔
چہرہ لال ہو جائے گا۔ دوا لے گی؟ ہشت! بالکل نہیں......

دویا آج انگریزی کمپوزیشن نہیں چھوئے گی۔ ایک دم نہیں.... صرف ناول پڑھے
گی' تکیے کے نیچے رکھ کر۔ فیل کرتی ہے تو.... ڈیم اِٹ....

نیم کے پیڑ پر دھوپ سرک رہی تھی۔ آہستہ آہستہ۔
دونوں کنٹیلے تاروں کے قریب سے افق میں گھور رہی تھیں مسلسل، کیا کچھ؟
کبھی نظریں بھٹک کر ریل کی پٹریوں تک چلی جاتیں، خود بخود ــ پٹیاں گو بجتیں....
چھک! چھک! دھواں پھیل جاتا اوپر۔ پہیے گھومتے رہتے۔ دھڑ! دھڑ!

دھڑا ڈبے گذرتے..... کالے سروں کا سمندر۔ کھڑکیوں سے کوئی ہاتھ نہیں ہلاتا۔۔

ٹاٹا!..... ٹاٹا!!

.... دُور تک خلا ۔ سناٹا..... کوئی آواز نہیں ۔ صرف پوسی رانی کی میاؤں

.... میاؤں. سوٹی! سوئی! چُپ.....

وہ چونک اُٹھیں۔

آنٹی آ گئی تھیں۔ بشیاملی۔ سفید نائیلیکس کی ساڑی میں لہریں اُٹھ رہی تھیں

کندھوں پر سیاہ بال اُمڈ پڑے تھے۔

"منّو!"

"آنٹی!"

"اندر چلو..."

کیسی سُندر ہے آنٹی! پھول جیسی کومل۔ جیسے دُودھ سے دُھلی ہو کیسے لچک

لچک کر چلتی ہے! ساکت کھڑی ہو تو لگتا ہے جیسے سرسوتی کی مورت ایستادہ

ہو۔ تیرے ہاتھوں کی دنیا کیا ہوئی۔ تیرے سر کا تاج۔ تیری سواری۔ سفید نہیں؟

ہاں کچھ موٹی ہو گئی ہے..... اُسے توجہ دینی چاہیئے..... لیکن ہے اب بھی

پریوں جیسی نفیس، حسین..... ! ہنستی ہے تو کیسا بھلا لگتا ہے! یکایک کھلکھلا

پڑے تو لگے جیسے ستار کے تار یکبارگی جھنجھنا اُٹھے ہوں۔ جھن، ن.....!

"رتّی! آ تیری چوٹیاں گوندھ دوں۔ سر دھویا تھا آج؟ ۔ تیرے

ناخن کتنے بڑھ گئے ہیں! ... گندی!"

بو نو! چل میرے پیر دبا ۔ زور سے... ہاں شاباش! ۔۔

دیدی، چائے..." چائے، چائے، چائے..."

"ماموں، تم اِتنی چائے مت پیا کرو۔ مجھے پسینہ آتا ہے ___ سچّی!"

آں! چل سگریٹ نکال ماچس..."

"اوں! کھوں، کھوں، کھوں ___ دھواں۔ اُدھر پھینکو ماموں!

دَم گھٹ جائے گا!"

پانی پلائے گی؟ ٹھنڈا۔

ماموں کیسے میٹھے گلے سے گاتا ہے ___ جیسے شیلندر سنگھ گا رہا ہو۔

میں شاعر تو نہیں۔ مگر.... اُف! یہ سگریٹ...... دھواں، دھواں۔ دھواں،

تلسی کے پودے کے پاس کھڑی نانی سنکھ بجا رہی تھی۔ چراغ کی لو تھرتھرا

رہی ہے۔ ہوا چل رہی تھی۔ سَر.... ر.... ر.... نانی ہاتھ جوڑے کھڑی ہے

آنکھیں مُوندے۔ ماں تو یہ سب مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہے۔ ڈھکوسلہ ہے

کبھی برت بھی نہیں رکھتی۔ مندر بھی نہیں جاتی.... تم نے دُرگا ماتا کو ناراض

کر دیا ہے ماں!..... ماں، ماں، ماں....

پچھواڑے مندر میں گھنٹی بج رہی تھی۔ ___ ٹن ___ ن، ن....

پرارتھنا شروع ہو گئی۔ کیرتن، کیرتن، کیرتن ___ کرشنا، کرشنا، کرشنا،

راما، راما، راما...

"ماموں! میں چلوں؟ پڑھنا ہے۔"

"ہوں....!"

ماموں جھپکیاں لے رہا ہے۔ تھک گیا ہے شاید؟ سو جا، سو جا

سوچا.....

اچانک جھلملاتی روشنی کو کالے دیو نے جھپ سے اپنے سیاہ کمبل میں لپیٹ لیا۔ کہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ دیوار سے دیوار تک ٹٹول ٹٹول چلیں۔ کھٹ! گر سکتا ہے۔ یہاں کس نے کھیٹ کر چھوڑ دی؟

"گھر میں موم بتی وغیرہ نہیں ہے؟ — جلاتے کیوں نہیں؟..... بجلی سالی..... ننّا ہیں۔ آج بہت سویرے لوٹ آئے؟ وہ تو اُجالے میں بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اندھیرے میں تو گر ہی پڑیں گے۔

"وہیں ٹھہرو ننّا! میں ٹارچ لاتی ہوں۔"

اندھیرا، اندھیرا، اندھیرا.....

آج موسی پھر ڈانٹ سُنے گی۔ ننّا پکاریں گے — شیفالی! آنٹی کیا جواب دے گی؟ نانی کہے گی — شیالی — تم کچھ نہ کہنا...! پروفیسر بے چارہ گالیاں سُنے گا۔

نانی سامنے آجائے تو ننّا بولتے بولتے یکایک چپ ہو جاتے ہیں۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو..... پپا جب بگڑتے تھے تو ماں اُبل پڑتی تھی۔ وہ کیا کیا بکتے۔ وہ بھی بکتی جاتی۔ وہ چیختے وہ بھی چیختی۔ وہ اُس کے بال پکڑتے۔ تھپڑ مار دیتے۔ وہ اُن کے ہاتھ میں دانت گڑا دیتی۔ پھر سسکتی تھی دیر تک..... سوں، سوں، سوں، چپ ہو جا ماں!..... چپ ہو جا..... چپ ہو جا..... چپ ہو جا.....

پپا کو کہاں چھوڑ آئیں ماں؟..... کدھر، کدھر، کدھر.....

پپا، پپا، پپا.....

میرے لئے گھوڑا نہیں بنو گے؟ چل، چل، چل، میرے گھوڑے چل....

"ریما! کیرم کھیلے گی؟ تاش؟ چائنیز چیکر؟ ــــ ڈلارڈ! اونگھتی ہے!
کھالے تب سونا.... چل، کچن میں چل ــــ آنٹی...."

بارش ہوئی تھی ــــ چاندنی کیسی نکھر آئی ہے ــــ شانت! ٹپ، ٹپ،
ٹپ،.... ہارسنگھار ٹپک رہے ہیں ــــ پتوں پر اوس کی بوندیں ہیں.
شیتل. تمہاری ٹھنڈی پیشانی کی طرح ماں!.... لیکن تمہارے ہاتھ تو تپ
رہے ہیں.....

.... انکل! تم میرے لئے گھوڑا نہیں بن سکتے ــــ تمہارا نفیس سوٹ
میلا ہو جائے گا ــــ دیکھنا ماں کے ہاتھ گدلے تو نہیں نا....؟

ایک ایک ہارسنگھار گوندھ کر تمہارے لئے گجرا بناؤں، ماں؟ مگر
تمہیں تو بیلے پسند ہیں؟ بیلے کے سوکھے ہوئے ہار تم نے بہت سنبھال
کر رکھے تھے. اُن کا کیا کرو گی؟.... خوشبو کے بنا پھول میں رکھا ہی کیا
ہے؟ خوشبو، خوشبو، خوشبو....!

جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی ــــ کہیں سانپ نہ ہو؟ باپ رے!
کاٹ لے تو ــــ موت! ریما بہت روئے گی ــــ اوں، اوں، اوں.....
ریما بھی سسکے گی ــــ ماں تو دھڑام سے بے ہوش ہو جائے گی. دانت بیٹھ
جائیں گے. اے! میں مرونگی نہیں. اتنے سارے لوگوں کو رُلانا اچھا لگتا
ہے کیا؟

گاڑی دھڑ دھڑاتی ہوئی گذر رہی تھی ــــ دَھڑ، دَھڑ، دَھڑ،

زمین کانپ گئی۔ تمہاری ٹرین کب آئے گی۔ ماں؟ ہمیں لینے آؤ گی نا؟ آنے سے پہلے تو تم خط لکھو گی۔ پہلے اپنی سروس کا ٹیلی گرام دو گی کب تک؟ — ماں، تم اکیلے آنا۔ چاچا جی بالکل خراب لگتے ہیں — انہیں ساتھ مت لانا.....

ہیں، ہیں..... شوں..... گھر..... ر..... کوئی کار تھی، نہیں جیپ، چندھیا دینے والی روشنی۔ آنکھوں میں چبھنے لگی۔ ہٹ سالے! جلدی سے موڑ کاٹ لو۔ یہیں سامنے کھڑی کرنا ہے! — اوہ!

پھاٹک کھول کر موسی دبے قدموں کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔

"شیفالی!"

"نانی نے کھڑکی سے پکارا۔"

"ہش!"

شیفالی نے ددیا کی بانہہ تھام لی۔

"سوئیں نہیں؟..... بُھّو!"

بہوت سی ددیا اُس خوشبو کی شناخت کی کوشش کر رہی تھی۔ جو ماں کے جسم سے کپڑوں سے، انگ انگ سے بھی اکثر پھوٹتی رہتی ہے.....!!

★ ★

چاہ کر بھی

نرم دوبوں پر ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک گم سم کھڑی ہو گئیں۔ چاند کو تکنے لگیں۔ پھر اُڑتے بالوں کو سنبھالا۔ پیشانی کو ہتھیلیوں میں دبوچ لیا۔ سر کو ایسے جھٹکا دیا جیسے ذہن میں پھنسے کسی چُبھتے ہوئے خیال کو جھٹکا رہی ہوں۔

چاند کی غالباً نویں یا دسویں تاریخ ہوگی۔ رات ایک پہر ڈھل چکی تھی۔ ہوا مند مند بہہ رہی تھی۔ چاندنی میں سونے اور چاندی کے ہلکے رنگوں کی آمیزش تھی۔

ہوا کے کسی جھونکے کے ساتھ کیاریوں سے پھولوں کی مہک دبے پاؤں لڑکھڑاتی آجاتی۔ وہ زور سے سانس کھینچتیں۔ چاہتیں ساری خوشبو اپنی سانسوں میں بھر لیں۔

شام میں کچھ دیر تک ٹوٹ کر بارش ہوئی تھی۔ آسمان دُھل گیا تھا۔ ہوا بھی نم ہو گئی تھی۔ سوکھے گھانسوں میں تازگی آئی تھی۔ سامنے ڈھلوان سے پَرے زمین کی نچلی سطح پر پانی کا جماؤ تھا۔ آکاش سے سیڑھیاں سیڑھیاں اتر کر چاند پانی میں آچھپا تھا۔ وہ شانت بہاؤ سے پانی میں تکتی رہیں۔

بغل کی کھڑکی سے چھن چھن کر روشنی باہر آرہی تھی۔ بچوّں کی دبی دبی ہنسی اور اُبلتے ہوئے قہقہے بھی کبھی کبھی گونج جاتے۔ سُپتا نے ٹاسک کر لیا ہوگا۔ سواتی

بھی کہانی کی نئی کتاب ختم کر چکی ہو گی. سکینہ کچن سے ممتاز اجی کو کھینچ لائی ہو گی.

انہیں روشنی سے جس قدر الفت تھی. اسی نسبت سے تاریکی سے گھبراتی تھیں. بجلی فیل ہو جاتی تو دیر تک ٹارچ جلائے رہتیں. یونہی بڑے بڑے پسینے سے شرابور ہو جاتیں. بے چینی جب حد سے بڑھ جاتی تو نہانے چلی جاتیں. بے وقت ایسی بد احتیاطی انہیں اکثر بیمار ڈال دیتی. سردی زکام میں مبتلا ہو جاتیں بخار سے تپتیں.

گذشتہ ہفتہ ایک شب زبردست حبس کے بعد زور کی آندھی اٹھی جھما جھم بارش ہوئی، اولے پڑے. بچوں کی طرح وہ بارش میں بھیگ بھیگ کر نہاتی رہیں. اولے چن چن کر چوستی رہیں. بارش تھمی تو تولیہ سے بال خشک کر کے اپنے اندر کچھ شگفتگی کا انہیں احساس ہوا. سرہانے بال پھیلا کر گہری نیند میں کھو گئی تھیں.

چل چل کر اب وہ تھکنے لگی تھیں. پرلی طرف اینٹ کے چبوترے سے ادھر بانس کی پھٹیوں تک آئیں. انہیں کے سہارے کھڑی ہو گئیں. اب تو وہ ذرا سا چل کر ہیجان محسوس کرنے لگتی ہیں پہلے بلا مقصد گھنٹوں سائیکل چلا کر بھی بے دم نہ ہوتیں. پسینہ تو ان دنوں بھی افراط نکلتا تھا. اب تو ہر موسم میں ذرا سی تحریک سے بلاؤز تر بہ تر ہو جاتا ہے. پنڈلیوں پر قطرے پھسلنے لگتے ہیں. انھوں نے آنچل سے چہرہ خشک کیا. انگلیاں بجائیں.

★

دھوپ کی چنچل کرنوں نے دریچے سے اندر جھانک کر ان کی آنکھیں کھولیں

انھوں نے کسمسا کر انگڑائی لی رات ٹھیک سے سو نہیں سکی تھیں۔ سر بوجھل سا لگا۔ سُچیتا آئینہ کے روبرو بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ سواتی ریک سے کتابیں نکال رہی تھی تکیہ کو سینہ سے چپٹاتے ہوئے انھوں نے کروٹ لی۔ سُمترا جی کو آواز دی۔ چائے کے لیے کہا۔

ستیسہ کا آج برت تھا۔ ہفتہ میں یہ ایک دن اُس کے لیے بڑا اہم ہوتا۔ سارا دن اہتمام سے گذرتی۔ نہا دھو کر سنتوشی ماتا کی آرادھنا کرتی۔ دیر تک آنکھیں بند کئے پرارتھنا کرتی رہتی۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھتیں۔ انھوں نے خود کبھی پوجا نہ کی تھی۔ مندر نہیں گئی تھیں۔ دیوی دیوتاؤں پر اُنہیں اعتقاد نہیں تھا۔ اپنے بُرے سے بُرے وقت میں بھی اُنہیں بھگوان کی یاد نہیں آئی تھی۔ بس اپنے آپ میں گم ہو کر رہ گئی تھیں۔

غسل خانے سے نکل کر وہ برآمدے میں آئیں۔ انھوں نے سیاہ بورڈر کی سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ آنگن میں تلسی کے پودے کے قریب ستیسہ پوجا کی تیاری میں تھی ہنس دی۔ آنکھیں ملیں تو وہ مسکرا دی۔ وہ ہنس دیں۔ انھوں نے پوچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

بالوں میں برش کر کے کندھوں پر بکھیر دیا۔ مانگ میں سیندور کی سُرخی جمائی۔ ہتھیلیوں پر، چہرے پر گلیسرن لگایا۔ میز کی دراز سے کچھ چھوٹے ضروری کاغذ کے پُرزے نکالے، قلم نکالا، پرس میں رکھا۔ کلائی میں گھڑی باندھی۔ مڑیں تو ستیسہ اگربتی کا دھواں لہراتی ہوئی آئی۔ ماں کی طرف پرشاد بڑھایا لمحہ بھر کے لیے وہ خندہ لب ہو گئیں۔ ستیسہ بالکل اپنے ڈیڈی پر گئی تھی۔

وہی آنکھیں، وہی چہرہ۔ انھوں نے جلدی سے رُومال سے ہونٹ صاف کئے
بیتے ہوئے اندھیروں کے بادل کبھی یونہی بے ساختہ اُمڈ پڑیں۔ تو وہ صاف کترا
کر نکل جاتی ہیں۔

شُمترا جی نے ناشتہ لگا دیا تھا۔ سُپتا اور سواتی میز پر جم چکی تھیں، انھوں
نے اُن سے دو ایک باتیں کیں، سواتی عادتاً کھلکھلائی انھوں نے چائے کی تیز
تیز چُسکیاں لیں اور کُرسی کھسکا کر جانے کے لئے مُڑیں۔

★

جب شام اُتر آئی تو آفس سے نکلیں۔ دن بھر ہدایتیں دیتی رہی تھیں۔
جیسا چاہتیں ویسا نہ ہوتا تو غرّا اٹھتیں۔ کسی کی مجال نہ تھی جو اُن سے آنکھیں ملا
سکتا یا پلٹ کر اُنہیں جواب ہی دے ڈالتا۔ حکم بہرحال حکم ہے اور اُس کی تعمیل
ہونی ہی چاہیئے۔ حکم عدولی کی عادی تھیں ذرا ذرا سی بھول کی سزا ملتی۔

آف ہونے کے بعد بے چین کیا۔ ننگے پیر دالان میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتی
رہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے گدلے پڑ گئے تھے۔ بیٹھک میں صوفے پر گرد جمی تھی
نوکر کو بلا کر ڈانٹا۔ کونوں سے مکڑی کے جالے صاف کراتی رہیں۔ پردے بدلوائے
کُشن جھڑوائے۔ کیاریوں میں پانی ڈلواتی رہیں۔

دُھندلکا بڑھا تو اُن کی بے چینی بھی بڑھی۔ بار بار سر جھٹکتیں، کلائیاں مروڑتیں۔
کبھی دھڑکن بڑھ جاتی کبھی حلق خشک سا لگتا۔ بالوں کو کھولتیں کبھی ناخن کترنے
لگتیں۔ کئی بار ہاتھ پاؤں دھو چکی تھیں۔ چہرے پر، آنکھوں پر، پانی کے چھینٹے دیئے
تھے۔ ہتھیلیوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ سر پر منوں بوجھ تھا۔

آہستگی سے چلتے ہوئے وہ مین گیٹ تک آئیں۔ پہرہ دار نے سلامی
دی۔ انھوں نے ذرا سا سر جھکایا۔ سائبان میں گملے قطار میں نہیں تھے۔ مالی کو آواز
دی۔ جھلّائیں۔ عقب کی بتیاں اب تک روشن نہیں ہوئی تھیں۔ زور سے گرجیں۔
صحن میں بچوں نے کاغذ کے پرزے بکھیر رکھے تھے۔ اُن پر برس پڑیں۔
سونے کے کمرے میں آئیں۔ وارڈروب کھولا۔ کپڑے اُلٹ پلٹ دیئے۔
خالی ہینگر نکال پھینکا۔ نیپھتیلن کی گھسی ہوئی گولیاں اِدھر اُدھر لڑھکانے لگیں۔
دراز کھول کر زیورات کا جائزہ لیا۔ وہیں چیک بک کے ساتھ آٹھ سال پہلے
کورٹ سے حاصل کیا ہوا طلاق نامہ پڑا تھا جس کی دستیابی سے قبل پپّا
نے کہا تھا ـــــ
"سارا لاکھ پدمنی سہی۔ مگر تم یہ پہاڑ سا جیون کیسے کاٹو گی؟ تنہا، اکیلی!"
تین راتوں کی تین نرانیاں گلے سے چمٹائے ہوئے مینا کا کبھی نہ جھکنے والا
سر اُس دن بھی نہیں جھکا تھا۔
تب سے آج تک کتنے سر اُن کے رُوبرو جھکے تھے ـــ اپنے نازک قدموں
تلے اُن سروں کو کچلتے ہوئے ہی کبھی کبھی چاہت سی ہوتی تھی کاش کسی کے آگے
وہ بھی سر جھکا سکتیں۔

★★

بانہوں کی پناہ

بس ایک خاموشی تھی جو چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔

جبکہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ ہانپ رہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ بلاؤز کے تلے بھی کچھ نمی سی آگئی تھی۔ ہتھیلیاں بھی پسیجنے لگی تھیں۔ اپنے لہراتے ہوئے آنچل سے چہرہ پونچھنے لگی۔ یومیپیا کی بھینی بھینی خوشبو اُس کی سانسوں میں گھلتی چلی گئی۔ سیلنگ فین کے نیچے اُسے قدرے عافیت ملی۔ صوفے پر وہ نیم دراز ہو گئی۔ آنکھیں موند لیں۔

کہیں سے کوئی آوارہ مہک اُڑتی ہوئی آئی جیسے کہ سگریٹ کا دھواں ہو —— ایک چھناکہ سا ہوا جیسے کہ کوئی جام گرے، ٹوٹ جائے۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا۔ چونک کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ پلکیں جھپکائیں۔ کہیں کچھ نہیں تھا۔ صرف سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوائیں —— چندن! چندن! چندن!

کھڑکیوں کے پردے سرسرا رہے تھے۔ دیوار سے لپٹی بیلیں کسمسا جاتی تھیں۔ باہر ہلکی پھواریں برس رہی تھیں۔ پنجرے میں بند مینا خموش تھی۔

شیڈ پر رُکی ہوئی. بوندیں دریچوں کے شیشے پر ٹپکنے لگی تھیں. تنفّاث شیشے دھندلانے لگے تھے.

اپنی کسی ہوئی زُلفیں اُس نے کھول ڈالیں. اُس کے شانوں پر، سینے پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں، بالوں کو سُلجھاتے ہوئے انگلیوں پر لپیٹنے لگی. اُس کے گداز ہونٹوں کے سرے کانپ رہے تھے. کوئی سرگوشی اُس کے کانوں میں آکر جم گئی ـــــ جیہ! جیہ! جیہ!

★

ابھی تو اُسی کی ہتھیلیوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں چھوٹا تھا. مانگ میں افشاں کے ذرّے بکھرے پڑے تھے. ایک دو چوڑیاں ٹوٹی ضرور تھیں، باقی کھنک رہی تھیں. اُس رات کے پھولوں کے گجرے مُرجھا گئے تھے لیکن اُس کے جسم سے صندل کی خوشبو اب بھی پھوٹ رہی تھی، یہ خوشبو تو اُس کی سانسوں میں رچی تھی.

.... اُسی سامنے سیج پر سج بجا کر، گھونگھٹ نکالے. گھٹنوں میں سر دیئے سمٹی سمٹائی وہ بیٹھی تھی. اندر ہل چل مچی تھی. باہر قہقہے اُبل رہے تھے، قدموں کی چاپ اُبھری تھی. وہ اور سمٹ گئی تھی. نتھ ڈول گئی، چوڑیاں بجیں، پائل میں جھنکار ہوئی ـــــ رَدی! رَدی! ردی!

اُن اجنبی ہاتھوں کے لمس سے وہ پگھل اٹھی تھی. اُس کے ہونٹ تھرتھرائے تھے، اُس کی گرم سانسیں اُس کی گردن سے چھو گئی تھیں. اُس کے رخسار دہک اٹھے تھے. اپنے کندھے پر اُس نے دباؤ سا محسوس کیا تھا. پھر کسا ڈھیر ڈھال

ہو کر اپنا سر اُس کے سینے سے ٹکا دیا تھا۔ آنکھیں مُوندے رہی۔ نرم لمحے خوابوں کی طرح اُس کے ذہن کی سطح پر تیرتے رہے۔

کلیوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھریں۔ مسلی گئیں۔ کاجل کی لکیریں پھیلیں بندیا بھی پھیل گئی مانگ کا جھومر آنچل سے لپٹا۔ کانوں کے آویزے بالوں میں اُلجھے۔ چھنچھناتی چوڑیوں کی کرچیاں چبھتے چبھتے رہ گئیں۔ تھکی تھکی سانسوں کی لَے ہموار ہوتے ہوتے اُسے صرف اتنا ہی یاد رہ گیا۔

"سگریٹ سے مجھے شوق نہیں!"

"شراب میں نہیں پیتا۔"

ردی! ردی! ردی!

★

مٹھیاں بند کر کے وہ ٹھوڑی کے سہارے بیٹھ گئی۔

اُس کے لمبے ناخن ہتھیلیوں میں چبھ رہے تھے۔ اُس نے ہولے سے ناخنوں پر ہونٹ رکھ دیا۔ ہونٹوں میں ہلکی ہلکی گدگدی سی ہوئی۔ ذرا سی دیر میں پسیج پسیج کر اُس کی ہتھیلیاں گیلی ہو گئیں۔ اُس نے ہتھیلیاں پھیلا کر ایک نظر ڈالی۔ پور پور بھیگ چلے تھے۔ لکیریں تر بہ تر تھیں۔ ساڑی کا آنچل اُس نے مٹھیوں میں دبا لیا۔

صوفے کے پچھلے سرے پر سر ٹیک کر اُوپر چھت کو گھورتی رہی۔ جا بجا نقش و نگار تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے دم بہ دم پنکھا ٹوٹ کر اُس

کے اوپر گر جائیگا۔ یا ممکن ہے یہ چھت ہی آ گرے، ایسے ہی اس نے اکثر محسوس کیا تھا۔ ہر ت
کہتی تھی یہ سب وہم ہے لاشعور میں چھپا ہوا کوئی خوف، حالات نئے
غیر محفوظ ہونے کا وسوسہ یا پھر کوئی اندیشہ۔

کیسی عجیب سی بات تھی یہ سارا ماحول اُسے اجنبی نہیں لگتا۔ بس رَدی کی
سانسیں غیر مانوس سی لگتیں۔ یہ در و دیوار اُسے آشنا سے معلوم ہوتے۔ کبھی پہلے
کبھی اُس کی پرچھائیاں یہاں اُبھری ہوں۔ دریچے پر کہنیاں ٹیک کر سامنے سے
گذرتے ہوئے ہجوم کو یہیں سے پہلے بھی کبھی دیکھا ہو۔ رِم جِھم کرتی پھواریں ایسے
ہی بوُند بوُند بالکونی پر رکھے قطار در قطار کیکٹس کے پودوں سے لپٹی ہوئی
آنکھوں کو بھلی لگی ہوں، بس ایسے ہی۔۔۔۔!!

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کھڑکی کے پٹ ڈگمگا گئے۔ بجلی کوندگئی۔ اُس نے
کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ بادل گرج رہے۔ وہ کچھ اور سمٹ گئی۔

۔۔۔۔ایسا ہی موسم تھا۔ گلہریاں بھیگ بھیگ کر درختوں میں جا چھپی تھیں
خرگوشں جھاڑیوں میں دُبکے پڑے تھے۔ پھولوں پر کوئی بھی تتلی نہ تھی۔ گھن گرج کے
ساتھ کہیں پاس ہی بجلی گری تھی۔ ایسے ہی سہم کر وہ سمٹی تھی۔ چندن نے اُسے لپٹا کر
اُس کی گردن کو اپنے گرم ہونٹوں سے چھوُ کر دھیرے سے کہا تھا

'بزدل'!

★

ساڑی کے کنارے دُرست کرتے ہوئے وہ اٹھی۔ شکنیں برابر کیں۔ جماہی
لی۔ انگلیاں بجائیں۔ انگڑائی لی۔ فین آن کر دیا۔ چل کر ڑنک تک آئی۔ ایک

لمحے رُکی۔ کچھ سوچا۔ مڑی۔ دروازے تک گئی۔ چٹخنی چڑھا دی۔ کھڑکیاں بھی بولٹ کردیں۔ روشن دان پر نظر گئی۔ کھلا تھا۔ ڈوری کھینچ دی۔ بند ہوگیا ریڈیو گرام پر وائلن کا ایل۔ پی۔ ریکارڈ چڑھا دیا۔ دلنواز دھن ابھری۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر کچھ اور اطمینان کیا۔ کانپتے ہاتھوں سے ٹرنک کھول دیا۔ سامان سے اٹا پڑا تھا۔ شادی کے جوڑے تھے۔ چادریں۔ سُرخ کامدار بنارسی ساڑیاں۔ بلاؤز، پشواز، بنفشیلین کی گولیاں لڑھک کر فرش پر گریں۔ گوٹے پٹھے سے مزین پوشاکیں، دستیاں ـــــ کونوں پر بوٹے کڑھے تھے۔ ٹھساٹھس کپڑوں کے نیچے سبز گٹ اپ کا ایک البم تھا۔ ایک بندھا ہوا پیکٹ۔ البم کا ایک ایک ورق الٹتی گئی۔ یادیں بکھری پڑی تھیں ایک تصویر پر نظریں جم گئیں۔ چند لمحے بے حس بیٹھی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ پیکٹ کھول دیا۔ لفافوں کا انبار لگ گیا۔ گلابی، نیلے، سفید۔

کچھ اپنی تحریریں تھیں، جنھیں بھجوا نہ سکی تھی۔ کچھ اُس کی۔ جا بجا الفاظ دُھندلا سے گئے تھے۔ کہیں کہیں آنسوؤں کے قطروں کے دھبے نمایاں تھے، کچھ اپنے، کچھ اُس کے، جذبات کا ایک ریلا آیا۔ بہرن سی ہوئی۔ اُس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے۔ کہیں قریب ہی سے آتی ہوئی۔ ایک آواز کی بازگشت مسلسل گونج رہی تھی۔

".... کاش مجھے کوئی جان لیوا مرض ہوجائے۔ کینسر ہی سہی! اسی لئے تو اتنا الکحل حلق سے اُنڈیلتا ہوں۔ اِس قدر دھواں نگلتا ہوں"

جمیہ سسک پڑی۔

"اِتنا سخت انتقام تو نہ لو۔ نہ لو!

چندن! چندن! چندن!

★

ٹیپ کھولے کتنی ہی دیر تک واش بیسن سے وہ چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتی رہی۔ تولیہ سے نمی خشک کرنے کے بعد آئینے میں اپنی ہی صورت کچھ بدلی ہوئی لگی۔ آنکھیں ذرا سوجی سی لگ رہی تھیں۔ رخساروں پر سُرخی تھی لیکن آنسوؤں کی لڑیاں گویا چپک چپک گئی تھیں۔ ہلکا میک اَپ کیا۔

باہر بارش تھم چکی تھی۔

کمرے کا قرینہ واپس آ گیا تھا۔

گھٹائیں بہت جُھکی تھیں۔ دھوپ کی کرنیں مچل مچل کر روشن دان سے نیچے گر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی اُمس کا احساس پھر سے ہونے لگا تھا۔

آہٹ سی ہوئی۔ قدموں کی چاپ تھی۔ رَوی تھا، ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے سے ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتا ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ جیہ بھی مسکرائی۔

بڑھ کر اُس کا کوٹ اتارنے لگی۔ بوٹ کے فیتے کھول ڈالے۔ موزے اتارے اُس کی پنڈلیاں بالوں سے بھری تھیں۔ رَوی نے اُسے بازوؤں میں کھینچ کر اوپر اٹھایا۔ لپٹایا۔ اُس کے لب کانپے۔ رَوی کی کنپٹیوں پر بال سفید ہونے لگے تھے اُس نے پلکیں جھکا لیں۔ اُس کی قمیص کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔

مَینا نے پَر پھڑپھڑائے۔ دونوں چونک پڑے۔ برآمدے سے ایک

بی گذر رہی تھی۔ ماں جی کچن میں داخل ہو رہی تھیں۔

"سارا دن بزی رہا ہوں۔ کافی ٹائرڈ ہوں۔ آئی نیڈ ریلیکسیشن! تیار ہو جاؤ۔ چوک تک چلیں۔ انجوائے کریں گے ۔۔۔ ذرا سنو!"

"نہیں!"

جیہ نے انگلیاں اپنے ہونٹوں پر رکھ لیں۔

★

شام کے بیشتر لمحے شاپنگ میں ہی گذر گئے۔ روشنیاں جگمگائیں۔ رات سرکنے لگی، شانہ بشانہ دونوں اپسرا میں آئے۔ بڑی رونق تھی۔ کوئی خاص پروگرام تھا۔ ٹیبل بوائے نے رہنمائی کی۔

"ڈنر!"

"مینو!"

"چکن، پلاؤ، کوفتے، رائتہ، شاہی ٹکڑے۔۔" روی نے آرڈر دیا۔

"پہلے ایک پیگ برانڈی!" جیہ نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

روی نے پہلو بدلا۔ اُسے تعجب ہوا۔

جیہ نے میز پر اُس کی ہتھیلیاں دبا دیں۔

"تم بہت تھک گئے ہو۔۔؟"

"مگر۔۔۔۔!"

"بوائے!"

ڈنر کے بعد جب جیہ نے روی کے لئے سگریٹ منگوایا تو حیرت سے اُس کے منہ سے صرف اِتنا نکلا ۔۔۔۔۔۔۔ "ارے!"

★★

اپنی آہٹیں

سب کچھ عمر کا تقاضہ تھا

تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی وہ برآمدے میں آئی۔ دوڑ کر آنگن میں گئی اور پھر اُچھلتی کودتی ہوئی زنان خانے کے بڑے دالان میں پہنچی۔ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ دبی دبی مترنم ہنسی اُس کے لبوں سے پھوٹ رہی تھی

"لیجئے وہ آگئی — یہاں آنا بیٹی۔"

"سبحان اللہ! کیا قد ہے، کیا جسم ہے! — تھوڑی تو آپ جیسی چیکر ہے۔ پیشانی دولھا بھائی کی طرح ہے!"

"سلام کرو بیٹی۔ یہ تمہاری خالہ جانی ہیں۔"

"آداب!"

"عمر دراز ہو! پروردگار نظرِ بد سے بچائے!"

"اُن دنوں اِتنی سی تھی۔ جب میں نے ترکِ وطن کیا تھا — ٹھمک ٹھمک کر دتی تھی۔ لہک لہک کر گاتی تھی — اب تو کافی سیانی ہوگئی!"

"ابھی تو بچی ہے! — بارہ کا سن کوئی عمر ہے بھلا!"

کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ امی کو برس اور مہینوں کی گنتی نہ آتی ہو لیکن غزالہ

کی عمر بتاتے ہوئے اُن سے ہمیشہ بھول چوک ہو جاتی. سنجیدگی سے انگلیوں پر رُک رُک کر شمار کرتیں. ہونٹ سکوڑتیں.

"ہائے، میری لاڈلی! اِس سال بارہ برس کی ہو جائیگی" بلائیں لیتے ہوئے کہتیں۔

"ماشاءاللہ! چشم بددور!!" والہانہ پن کے ساتھ اُس کی پیشانی چوم لیتیں

اُن دنوں بھی جبکہ اُس کے اعضا آج کی طرح نکھرے نہ تھے. اُس کے جسم کے بالائی حصے میں تناؤ تھا نہ زیریں حصے میں دلکش پھیلاؤ۔ امّی غزالہ کے بارہویں برس میں قدم رکھنے کا اعلان کرتی تھیں۔ اب تو اس کے انگوں سے رس ٹپکنے کا گمان ہوتا تھا. اُس کے جسم کی ساری شکنیں امّی کے ہاتھوں کے لمس سے آشنا تھیں. امّی ایسے ہی اُسے بناتیں. سنوارتیں. جیسے کہ ایک ننھی منّی گڑیا ہو! نت نئے طریقوں سے چوٹیاں گوندھتیں. کبھی پونی ٹیل بناتیں، کبھی یونہی کھلے بال کو رنگین ربن سے کس دیتیں. کبھی ریشمی اِسکارف لپیٹ دیتیں. آنکھوں میں مہین کاجل لگا کر، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہیں ہموار کرتیں گھما پھرا کر لباس کی موزونیت کا اندازہ کرتیں.

"سبز سوٹ پر گلابی دوپٹہ نہیں ——— وہ پستئی جالی والا شیفون کا دوپٹہ اچھا رہے گا. ٹرنک سے نکال لاؤ بیٹی"

"سنبھل کر دھیرے دھیرے چلو۔ ایڑی کافی اونچی ہے. پیر نہ پھسل جائے"

"گردن اتنا کیوں جھکاتی ہو.؟ ——— سر اُٹھاؤ۔ تن کر چلو"

"شکر اللہ!"

قدرے مطمئن ہو کر سانس آہستہ سے چھوڑ تیں۔ ہونٹوں کو ذرا بھینچ لیتیں۔ ایسے لمحوں میں اُن کی لَویں سُرخ ہونے لگتیں۔

غزالہ کچھ سانولی سلونی تھی۔ امّی کا گورا پن اور ابّو کا گندمی رنگ اُسے نہ ملا تھا لیکن اُس کی بڑی بڑی کتابی چہرہ پہ حد درجہ صباحت تھی۔ اُس کی بڑی بڑی شوخ آنکھوں میں بلا کی مستی تھی۔ امّی کہتیں ایسی آنکھیں ہرن کی ہوتی ہیں یا گل نرگس کی۔ اُن میں بحر بیکراں کی پنہائی ہے۔ اور نیلگوں آسمان کی وسعت ساری کائنات کی کشش اُن میں یکجا ہو گئی ہے۔ امّی خود اُس کی بھویں درست کرتیں۔ پلکیں سنوارتیں۔ کانوں میں سنہری بالیاں پہناتیں اور گلے میں مصنوعی موتیوں کا ہار یا طلائی نیکلس۔ کبھی جی میں آتا تو پیشانی پر جھومر بھی سجادیتیں اور مانگ میں جگ مگ کرتی ہوئی کیل یا نتھ سج دھج کر غزالہ دلہن کی طرح لگتی۔ بس مانگ میں ایک ذرا افشاں کی کمی ہوتی اور زلفوں میں پھول کے گجروں کی اور مصنوعات کی جگہ مسی اور صندل کی ایسی آرائش کے بعد آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ شرمانے لگتی۔ غزالہ کی حیا باز نگاہیں امّی کو کافی بھلی لگتیں تھیں۔

خود تو وہ سادہ رہتیں۔ سفید پوشاکیں، اُنہیں بے حد پسند تھیں۔ سفید ساریاں، سفید غرارے، شلوار قمیص۔ غزالہ کبھی اصرار کرتی تو گہرے سبز، سُرخ رنگوں کو ترجیح دیتیں ———— بڑے بڑے بیل بوٹے۔ اُنہیں اچھے لگتے۔ ریشمی کپڑے انہیں زیادہ پسند تھے۔

اُن کی نفاست پسندی بے مثل تھی۔ بلا ناغہ اُبٹن ملواتیں۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتیں۔ اہتمام سے مہندی لگاتیں۔ آنکھوں میں سُرمے کی سلائیاں پھیرتیں۔

خوشبوؤں کی بھی دِلدادہ تھیں۔ سرِ شام عود اور اگربتیاں جلاتیں، حنا موتیا، کیوڑا، گلاب اور دیگر عطریات کی مِلی جُلی مہک اُن کے کمرے میں پھیلی رہتی۔ گرمیوں میں جوہی اور بیلے کی کِھلتی کلیاں سرِ بالیں رکھتیں۔ اُن کی سانسیں معطر ہونے لگتیں۔ ایک دبیز طمانیت بھری مُسکراہٹ اُن کے لب و رخسار پر رقصاں ہوتی۔

دونوں کی صُورت شکل، قد و قامت میں ہلکی مماثلت کے باوجود غزالہ کا بدن ذرا چھریرا، کسا کسا تھا۔ امّی کے جسم کے خطوط مبہم اور غیر واضح تھے۔ اُن کا سینہ اور کولھے سپاٹ تھے۔ آنکھوں کے گرد مدھم سیاہ ہالے پڑ گئے تھے۔ خدوخال سمٹنے لگے تھے۔ اپنے بالوں کو بہت اُوپر کھینچ کر نئے طریقے سے جوڑا باندھتیں لیکن غزالہ کی پیشانی کی کُشادگی اُن کی اپنی پیشانی کی کوتاہی کو اور بھی نمایاں کر دیتی۔ دونوں جب ساتھ ساتھ لگ کر کھڑی ہوتیں تو یہ بات بھی کھُل جاتی کہ غزالہ اب سر سرا کر اونچی، لانبی ہو جائے گی، ممکن ہے امّی اور بھی جھک جائیں، بہت نیچے رہ جائیں۔

غزالہ کے دانت ہموار، چمکیلے اور آبدار تھے۔ اُس کی مسکراہٹ بڑی دلفریب ہوتی۔ امّی کے دانتوں پر بدنما دھبّے پڑنے لگے تھے۔ وہ بڑے بڑے اور غیر متوازن تھے۔ امّی جب مُسکرائیں تو کراہیت ہوتی۔ امّی کے بدن کی ساخت شکستہ ہوتی جا رہی تھی۔ اعضا ڈھیلے ہو رہے تھے۔ گوری جِلد پر بہت سارے کتھئی مائل نشان اُبھر آئے تھے۔ ٹھوڑی پر، رخساروں پر، پیشانی پر چھوٹے بڑے کتنے ہی تل بکھرے پڑے تھے۔ ہونٹوں کے اُوپر بھُورے بالوں کی لکیر اُجاگر تھی۔

بازوؤں اور کولھوں کے نرم پٹھوں میں انگلشی لگواتے ہوئے کتنی بار امّی نے محسوس کیا تھا۔ اُن کی رگوں میں توانائی سرایت کر رہی ہے۔ رخساروں پر سُرخی دوڑ گئی، آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی، بانہیں گداز ہو گئیں۔ گردن خم دار، ہونٹ لعل و گہر! چھوٹی چھوٹی زلفیں دراز ہو کر کمر تک پہنچ گئیں......"

امّی قیمتی سنو، کریم سے صورت کو دلنواز بنانے کی کوشش کرتیں۔ خضاب اور بوما ہیر آئل سے بالوں کی سُفیدی چھپاتیں نوک پلک بجا کر اپنی شخصیت کو جاذبِ نظر بناتیں۔ اُن کے اٹھنے بیٹھنے میں کافی سلیقہ تھا۔ گفت و شنید میں قرینہ اور سنجیدگی کی قائل تھیں لیکن بات بے بات قہقہے لگا کر باطنی فسردگی کو ظاہرہ زندہ دلی سے منسوب کرنے کے فن سے بھی واقف تھیں۔ خُوب خُوب فقرے چُست کرتیں۔ لطیفے سُناتیں، اور ہنستے ہنستے بے دَم ہو جاتیں۔ سانسیں ڈگمگانے لگتیں۔ گھٹن سی محسوس کرتیں۔ مسلسل کھانسی کا دورہ پڑتا۔ آنکھیں اُبلنے لگتیں چہرہ تمتما اُٹھتا۔

غزالہ کو وہ ہمیشہ اپنے روبرو رکھتیں۔ ایک پل کے لئے اُس کی جدائی انہیں گراں گزرتی۔ غزالہ چاہتی امّی کو جُل دے کر چھت پر نکل جائے۔ ہر وقت سائے کی طرح اُن کا پیچھے لگے رہنا اُسے قطعی اچھا نہیں لگتا۔ وہ تنہائی چاہتی۔ خاموشی چاہتی بند کمرے میں اوندھے مُنہ لیٹ کر، بغلوں تلے ملائم تکیہ داب کر حسین خوابوں میں کھو جانا چاہتی۔ چھجے پر کھڑے ہو کر سامنے والے کمپاؤنڈ میں ٹینس کے کھیل سے بہت محظوظ ہوتی تھی۔ سوچتی کاش اُس سفید گیند کی مانند ہی بن جائے۔ یونہی اُچھلتی پھرے۔

غزالہ ہر وقت خمار میں ڈوبی رہتی۔ دیکھتے دیکھتے اُس پر غنودگی چھا جاتی۔ امّی نڈھال نڈھال سی کروٹیں بدلتیں۔ اکثر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ نیندیں اُڑ جاتیں تو تہجد گزار بن کر شب بیداری کرتیں۔ سر پر سفید آنچل لپیٹے۔ پلکیں جھکائے دعائیں مانگتی رہتیں۔ اپنے لئے، غزالہ کے لئے، اس کے ابّو کے لئے۔ خدایا! یہ بھی کوئی زندگی ہوئی! ساری آسائشیں حاصل ہوں پھر بھی ایک ایسی ناگزیر خواہش تو ہوتی ہے جس کی تکمیل ناممکن ہو۔ سارے ارمان گھُٹ جائیں۔ خوابوں کی کوئی تعبیر نہ ہو۔ جذبات سسکتے رہیں۔ کسی کی غلط اندازنگاہوں سے احساسات بیدار ہو جائیں۔ اپنا آپ نہ پہچانا جائے۔

..... وہ سب کچھ تو اچانک ہو گیا تھا، اور پھر مسلسل سترہ برسوں سے ابّو پر تحلیل نفسی آزمانے کی باتیں سوچی جا رہی تھیں۔ مگر اُن پر کسی کا بس بھی تو چلے! کسی کے سنبھالے سنبھلیں تو سہی!!

امّی کی مانگ میں صرف سیندور کی پرچھائیاں تھیں اور کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور ہونٹوں پر رینگتی ہوئی پھیکی سیٹھی مسکراہٹ، اُن کے دل میں ایک عجیب سی تمنّا دنوں دن پروان چڑھ رہی تھی کہ غزالہ یونہی گڑیا سی رہے، ننھّی مُنّی سُبک سُبک !!

★ ★

سُرخ آنچل کے تلے

سامنے آئینہ میں میرا عکس ہے اور میرے ذہن کے پردوں پر کئی زمانوں کے خدوخال اُبھر رہے ہیں۔ ـــــ

اب میری ایک نئی کائنات ہو گی، ایک نیا جہاں ہوگا، ایک نیا آسمان ہو گا۔ ماضی کے قمقمے بجھا دوں تو اچھا ہے۔ مستقبل کی تابناکیوں پر حال کے سائے بھی نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ کون جانے کیسے دن آنے والے ہیں۔ آگے کی کسے خبر ہے...

لیکن میں سکون چاہتی ہوں، چند ساعت کے لئے۔ تاکہ اپنے اضطرار، اپنی بے چینی کو خوابیدہ کر سکوں۔ ـــــ میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم ساکت ہو جائیں مجھے اس کی فکر نہیں۔ میری چڑھتی ہوئی سانسوں کا گلا رُندھ جائے۔ مجھے اس کا بھی خوف نہیں۔ میری ساری قوتیں سلب ہو جائیں، مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ میں ڈرتی ہوں، تو بس اپنی یادوں سے، اپنے ماضی سے!

دُور بہت دور، آسمان کی پہنائیوں میں ایک ستارہ روشن ہے۔ ہر شام اُس کا مقام بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی اِدھر، کبھی اُدھر ـــــ لیکن میری آنکھوں سے یہ کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ اس کی روشنی، اس کی چمک ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ یہ میرا ماضی ہے۔ یہ میرا انجم ہے۔

انجم کی باتیں، انجم کا لہجہ، انجم کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ اُن کی قربت کے لمحات کی یادیں اب بھی مجھے تسکین دیتی ہیں۔ اُن کے ساتھ گذرے ہوئے شب و روز کی پرچھائیاں اب بھی میرے آگے آجاکر ہوتی ہیں۔ میں بے چین ہو جاتی ہوں، مدہوشی سی چھانے لگتی ہے۔ سہیلیاں مجھے سہارا دیتی ہیں۔ لیکن میری مضمحل طبیعت کو کون سہارا دے گا۔ کون میرے بے چین ارمانوں کو تھپکیاں دے سکے گا ـــــ نہیں! نہیں! ! ـــــ وہ ... ا ... ا ... ل دہ ... ا ... و ... دہ ... رر

انہیں میری بیتی خوشیوں کا علم نہ ہونا چاہیئے۔ مرد لاکھ ترقی یافتہ سہی لیکن اِس معاملہ میں اُن کے خیالات بہت فرسودہ ہوتے ہیں۔ اور میں نہ چاہوں گی میرے جذبات و احساسات کو کوئی اور مجروح کرے عجیب ہے ہماری دُنیا بھی۔ دِلوں پر پابندیاں۔ فکر و نظر پر پہرے، چاہت اور محبت پر رُکاوٹیں!!

آج جب ہر طرف رنگینیاں ہیں۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ ہے، سب کے دلوں میں خوشی ہے، میرا دل بہت بوجھل بوجھل ہے، میرے خیالات پریشان پریشان ہیں۔ میری یادیں اُلجھی اُلجھی ہیں، میرے چہرے کی رعنائی، میرے دِل و دماغ کی پژمردگی کو چھُپانے میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اتنا ضرور محسوس کرتی ہوں، مجھے اس حال میں دیکھ کر انجم مچل گئے ہوتے۔ اور اُن کی آنکھوں کی تاب نہ لاکر میں شرم سے گلنار ہو جاتی۔ میرے انگ انگ سے آج خوشبوئیں پھُوٹ

رہی ہیں۔ میرے ہاتھ سے حنا کی خوشبو، میرے جیکر سے اُبٹن کی خوشبو۔ صندل کی خوشبو، میرے ہونٹوں سے مستی کی خوشبو، اور میرے چہرے سے حیا کی خوشبو اُمڈ رہی ہے کاش! یہ خوشبوئیں میرے دل سے اُٹھتے ہوئے غبار پر چھا جائیں۔!!

مجھے خود پتہ نہیں چلتا، انجم کے قریب رہ کر، اُن کی باتوں کے سحر میں کھو کر میں کن بلندیوں کو چھونے لگی تھی۔ کن سرور انگیز گھڑیوں سے محظوظ ہوئی تھی۔ کن بلند منازل کو سر کر سکی تھی۔۔۔۔ انجم کو دیکھ کر، انجم کے ساتھ ہنس بول کر مجھے کتنا سکون ملتا تھا! کس دنیا میں پہونچ گئی تھی میں، سپنوں کے دیس میں یا اُجالوں کے شہر میں!!

انجم کے والہانہ چاہنے کا انداز کتنا نرالا تھا۔

میرے سامنے وہ بیٹھ جاتے اور اُن کے مُنہ سے پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔

"اُف شہناز! یہ تمہاری آنکھیں ہیں۔ یا جھیل میں کھلتے ہوئے کنول کے پھول!"

میری پلکیں جھکنے لگتیں۔

"جانے کب ان آنکھوں کا شرمانا جائے گا۔"

وہ ہولے ہولے گنگنانے لگتے۔ میرے لبوں پر ہنسی پھیل جاتی۔

"ہائے! یہ تبسّم!! مجھے تو دارجلنگ کے ٹائگر ہل سے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کا سماں یاد آ گیا۔"

میرا چہرہ دہکتا انگارہ بن جاتا۔

"تمہارے چہرے پر تو شعلے بھڑکنے لگے۔ کہو تو اپنا سگریٹ جلا لوں!"
میں ہتھیلی سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی۔ سگریٹ کا دھواں میرے ارد گرد منڈلانے لگتا۔

"میرے ہونٹوں کو کچھ اور دینا نہ کہ سگریٹوں کی حرارت نہ دینا:"
انجم کی روح کی موسیقی میرے جسم میں خون کی گردش تیز کر دیتی۔ دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتیں اور میں کانپ جاتی۔

قانون میں گریجویٹ ہونے کے بعد انجم جوڈیشیل سروس کے مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابا جان کی خواہش تھی، انہیں کی طرح انجم بھی جج بنیں۔ انجم کا پچھلا ریکارڈ اتنا اچھا تھا کہ سب کو رشک ہوتا۔ ابا کے ایماء ہی پر انھوں نے قانون کا مطالعہ کیا۔ ویسے اُن کا رجحان ایجوکیشن لائن کی جانب تھا۔ ابا جان نے ہمیشہ اپنے رشتہ داروں کا خیال کیا ہے۔ سدا اُن کی بہتری کے بارے میں سوچا ہے۔ اپنے کیا پرائے بھی ابا کے کردار کے اس پہلو کی وجہ سے اُن پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ اُن کی باتوں کا احترام کرتے ہیں۔ سُہیل پھوپھا تو خیر سے اپنے ہیں۔ انجم، پھوپھا جان ہی کی طرح سیدھی سادھی طبیعت کے ہیں۔ باپ کا اثر بیٹے پر کسی نہ کسی طور پر ضرور ہی پڑتا ہے میرے ابا کی رائے کو پھوپھا ہی رد کر سکے اور نہ انجم ہی۔

آج سہیلیاں بابل کا گیت گا رہی ہیں۔ میں بھی کبھی لہک لہک کر ایسے گیت گاتی تھی لیکن اس گھڑی میری اُداس طبیعت کی ساری نغمگی، ساری شگفتگی ماضی کی داستان بن کر رہ گئی ہے اب تو جی چاہتا ہے کوئی اِس چہل پہل کو

روک دے۔ کوئی ہنستے ہنستے رو پڑے۔ آنسوؤں کا سیلاب آ جائے۔ میں ڈوب جاؤں۔ ساری دُنیا ڈوب جائے۔ ہر طرف ماتم ہو۔ ہر سمت ویرانی ہو!

اے کاش! کوئی انجم کو نظرِ بد سے بچائے۔ اُنہیں کچھ ہو نہ جائے قانون کے محافظ بن کر میرے انجم کتنے سنجیدہ ہو گئے ہوں گے۔ اُن کی طبیعت کا سارا کھلنڈرا پن دُور ہو گیا ہو گا۔ خُدا کرے کل وہ مُنصِف سے جج بنیں۔ پھر سب سے بڑے جسٹس!! الہٰی! تو اُنہیں اپنے سایہ میں رکھنا۔ چار سال پہلے جب انجم نوشہ بنے تھے تو میں نے اُن کے بازو پر امامِ ضامن باندھا تھا۔ یا اللہ! لیکن اس کا اثر کیا ہوا تھا!! انجم کو کتنی بدشکل بیوی ملی۔ مزاج بھی ماشاءاللہ چہرہ سے کسی طرح مختلف نہ تھا انجم کی قسمت پر میں خود رو پڑی تھی۔ یہ ہمارے معاشرہ کی گُھٹن کتنوں کو پامال کر دیتی ہے!!

مجھے یاد ہے، بہت پہلے جب کبھی انجم ہمارے یہاں آتے، تو چھُپ چھُپا کر میرے کانوں میں دھیرے سے سرگوشی کرتے۔

"شہناز" ! میرے لئے دُلہن لانا تو اپنی طرح!..... نہیں تو، نہیں تو....."

وہ میری گردن میں جھول جاتے۔ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا۔ میرے آگے قوسِ قزح پھیل گئی ہو۔ رنگ برنگی تِتلیاں ناچ رہی ہوں۔ میں ہوا میں اُڑی جا رہی ہوں، پھر تو گھنٹوں تنہا کمرہ میں بند رہتی۔ آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی۔ کبھی بال سنوار کر، کبھی بکھرا کر، کبھی آنکھوں میں کاجل کی

لکیریں سجا کر اور کبھی ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سُرخی لگا کر، کبھی کھڑی ہو کر اور کبھی بیٹھ کر، انگڑائی لیتے ہوئے یہ میں تھی یا میرے خوابوں کی کوئی شہزادی!!

جب انجم کی بارات چلی تھی۔ رشتہ داروں، اپنے پرایوں اور براتیوں کے قہقہوں کا ساتھ میں نے دیا تھا۔ لیکن میرے ڈوبتے دل کی کون سن سکتا تھا بھلا دل کی باتیں دل تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ دوسروں کو کیسے خبر ہوتی۔!!

شادی کے دو سال بعد تک انجم کے ازدواجی تعلقات کچھ کچھ ہموار رہے تھے لیکن ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ شکیلہ لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی تھی۔ تب انجم نے مجھے بتایا تھا۔ ایک ہیجان، ایک طوفان کے بعد کچھ سکون کی اُمید بندھی تھی۔

پچھلے سال جب میں سُہیل پھوپھا کے یہاں گئی، جاوید مجھ سے چمٹ گیا، کتنا معصوم تھا وہ! ویسا ہی چنچل، ویسا ہی خوبرو جیسا کہ انجم! باپ بیٹے کی شکل شباہت، فطرت میں کچھ فرق ہی معلوم نہ ہوتا۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی تھی۔ کاش! جاوید میرا بچہ ہوتا!! میں نے اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔ پھر میرا دل چاہا تھا اسی طرح مجھے بھی کوئی.....؟" اور انجم سے میں نظریں نہ ملا سکی۔

اِس گھڑی ایسا محسوس کر رہی ہوں انجم ابھی ابھی شام کو گھوم کر لوٹے ہیں ٹائی کی ناٹ کھول رہے ہیں۔ میں اُنہیں دیکھے جا رہی ہوں۔ جی چاہتا ہے اُنہیں آنکھوں میں سمیٹ لوں آنچل میں چھپا لوں، کوئی انہیں چھین نہ لے۔ لیکن میں کتنی

بے بس ہوں! کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔ صرف سوچ سکتی ہوں، بلندیاں ہی بلندیاں ہیں۔ میرا اُدھر کہاں گذر رہے! میں ان دیواروں کو نہیں ڈھا سکتی۔ ان بلندیوں کو نہیں پھلانگ سکتی۔

لا۔ کرنے کے بعد انجم ایک سال تک ہمارے یہاں رہے۔ ابا اُنہیں کمپی ٹیشن کے لئے گائڈ کر رہے تھے۔ اُس دَور کی میری کچھ یادیں انجم سے وابستہ ہیں۔

میری طرف دیکھ کر اُن کے مسکرانے کا انداز!

میرا آنچل پکڑ کر مجھے کھینچ لینے کی ادا!!

میری باہیں تھام کر میری نس نس میں شرارے بھر دینے کا جذبہ!!!

میری تھوڑی اٹھا کر، میری آنکھوں میں جادو جگانے کا فن!

میری رُوح، میرے احساسات کو جھنجھوڑ دینے کی لگن!!

.... لیکن میں نے زمین پر رہ کر کبھی آسمان کو چھو لینے کا خواب نہیں دیکھا۔ میں ڈرتی تھی، کہیں یہ لمحاتی سکون مجھے ہمیشہ کے لئے برباد نہ کر دے۔ کہیں میرے سپنوں کے شیش محل مسمار نہ ہو جائیں۔ میں ہمیشہ انجم سے بچتی رہی۔ بس میں نے جو کچھ کیا۔ اُن کی باتوں پر مسکرا پڑی۔ اُن کی اداؤں پر شرما گئی۔ اُن کی حرکتوں پر سمٹ گئی۔ اُن کی آنکھوں سے گھبرا کر اپنی آنکھیں موند لیں جب میرے احساسات جاگنے لگے۔ اُنہیں تڑپتا چھوڑ کر الگ ہٹ گئی اور میں کیا کر سکتی تھی بھلا ! چاہتی تھی انجم کو میں خوشی دے سکوں، لیکن اِس طرح نہیں کہ اُن کی زندگی میں مسرتوں کی جگہ رُسوائی کا دور دورہ ہو۔

وہ پڑھنے میں مگن رہے۔ میں اُن کے لئے منتیں مانتی رہی، خدائے بزرگ و برتر سے اُن کے لئے دُعائیں کرتی رہی ـــــ الحمد مقابلہ میں کامیاب رہے آج وہ منصف ہیں۔

یہ شہنائیوں کی آوازیں میرے کانوں میں ایسے گونج رہی ہیں جیسے کسی عُمر رسیدہ کی ارتھی کے ساتھ باجے بج رہے ہوں۔ اِس سُرخ جوڑے میں ملبوس آئینہ میں میرا عکس ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میرا سارا وجود خون میں لت پت ہو۔ دُور دُور تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ مجھے روشنی کی کوئی لکیر نظر نہیں آتی۔ ماضی کے دھندلکوں میں نگاہیں بھٹک جاتی ہوں۔ مستقبل کے بارے میں سوچتی ہوں تو سر چکرا جاتا ہے۔ یا الٰہی! مجھے گمراہ ہونے سے بچالے!!

میرے دِل پر کیسے کیسے بوجھ ہیں! اپنا غم، خاندان کا وقار، دوسروں کی خوشی اور میرے پیروں کی زنجیریں ـــــ لیکن سوچتی ہوں میرا قصور کیا ہے؟ مجھے میری حیات کی اِن تیس بہاروں میں جن امتحانات، جن مراحل سے گزرنا پڑا ہے، کیا میرے قدم ڈگمگا نہیں سکتے تھے؟ کیا میں بغاوت نہیں کرسکتی تھی؟ اِس ننھی سی جان پر کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹے لیکن میں نے اُف بھی نہ کی۔ میرے آنسو بھی نہ نکل سکے۔ اور میرا قصور، میرے ابا کی غلطی، میری ماں کی مجبوریاں ـــــ یہی ناکہ میری ماں ایک طوائف تھی ـــــ میرے ابا نے اُسے دوزخ کی آگ سے نکالا تھا تاکہ ایک ایسی نسل کا وجود ہو جسے بہشت کی ہوائیں میسر آسکیں! اور دُنیا نے مجھے یہ سزا دی! اُف! کب بدلے گا، ہمارے

سماج کا نظام!!

....اور اب قہقہے تیز ہو چلے ہیں۔ آوازیں شور بن رہی ہیں۔ شہنائیاں چیخ رہی ہیں۔ ڈھول چنگھاڑ رہے ہیں۔ شاید برات پہنچ گئی۔ میری اپنی برات! —— یہ کون ہے جو مجھے ایک نئی دنیا میں لے جانا چاہتا ہے۔—— جانے کون ہے یہ؟ کوئی بھی ہو، اب میری کائنات کا یہی خدا ہے! میرے جسم کا یہی مالک ہے!.... لیکن دِل پر کس نے فتح حاصل کی ہے؟ کسی نے نہیں! دِل کے ہاتھوں میں ہمیشہ مجبور رہوں گی —— ایک آگ میرے سینہ میں ہمیشہ دہکتی رہے گی —— ساری زندگی جلتی رہوں گی لیکن دوسروں کو اِس جلن کا احساس نہ ہوگا۔

سہیلیوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں، کچھ بھی تو نہیں ——!

میرے ذہن میں خلاء ہے، آنکھوں میں دھواں ہے، کانوں میں بے پناہ شور و غل کی لہریں ہیں!!

★

کل کے سپنے

"سو گئیں کیا؟"

میں نے سلمیٰ کو آواز دی، مگر وہ دم سادھے لیٹی رہی۔

گھپ اندھیرے کے دامن کو نصف چاند کی رُوپہلی روشنی اب ہولے ہولے نِگلنے لگی ہے۔ میرے تنگ و تاریک کمرے میں خاموشی کسمسائی پڑی ہے۔

کلائیاں ہلتی ہیں تو چوڑیوں کی مدھم مدھم کھنک اپنی دلنواز موسیقی سے ماحول کی جاذبیت کو بڑھا دیتی ہے۔

آج سلمیٰ بھی مجھے غلط سمجھ بیٹھی۔ میری سوچ مجھے کہاں لے آئی!

عجیب سحرزدہ عالم ہے۔ صرف میں جاگ رہا ہوں۔ ساری دُنیا سو چکی ہے۔ اکثر راتیں میں اِسی پس و پیش میں گزار دیتا ہوں۔ نیند آتی ہے تو ڈراؤنے خواب ستاتے ہیں۔ آنکھ کھلتی ہے تو یاس کی تلخیاں رگ و پے میں سرایت کرنے لگتی ہیں۔ بے چین ہو کر کروٹیں بدلتا ہوں۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتی ہیں سکون چھن جاتا ہے۔ آخر زلفوں کی گھنی چھاؤں مجھے اپنی سکون بخش پناہ میں لے لیتی ہے۔ میرے جلتے ہونٹوں پر شبنمی تراوٹ بکھر جاتی ہے۔

کاش! یہ لمحے جاوداں ہوتے!

ان ساعتوں میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ بھیانک خواب اور ڈراؤنی تعبیریں، روتی بسورتی شباہتیں اور چیختی چلاتی آوازیں۔ غم واندوہ کی آندھیاں اور مصیبتوں کی یلغار سب ذہن سے اُڑ جاتے ہیں۔

سلمیٰ میری شریکِ حیات ہے۔ اُسی کے سہارے زندگی کی مشکل راہوں پر چل پایا ہوں۔ وہ میرے دوش بہ دوش اگر نہ ہوتی تو میرے قدم لڑکھڑا گئے ہوتے۔ گرتے ہوئے مجھے کون سنبھالتا؟ کون میرے بازو تھامتا بھلا؟ میری زندگی سلمیٰ کی مقروض ہے اندھیرے کی روشنی، ویرانوں کی بہار، تپتی صحراؤں کی نسیم —— سلمیٰ میرے لئے ان سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے لیکن میں نے سلمیٰ کو کبھی خوشی نہیں دی۔ سدا دُکھ ہی دیا ہے۔ کبھی وہ جو مسکرائی تو یہ مسکراہٹ میں نے چھین لی۔ میں واقعی اتنا ظالم ہوں کیا؟ ہاں یہ ظلم ہے! سفاکی ہے!! مگر سلمیٰ کیا جانے میں کتنا مجبور ہوں۔ میں نے اُسے نہیں، اپنے آپ کو ستایا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا گردنیں جب جھکتی ہیں۔ تو جھکتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کی عزت اپنی نگاہوں سے بھی ختم ہونے لگتی ہے، کتنا حقیر، کتنا کمتر وہ خود کو محسوس کرتا ہے۔ روح بلکتی ہے۔ ضمیر چیختا ہے۔ مگر آدمی کی بے بسی و بے چارگی کی کوئی حد ہے، نہ کوئی پابندی!

عورت میں اتنا صبر کہاں؟ وہ تو موم کی مانند ہوتی ہے۔ رنج کی ذرا سی رمق سے پگھل جانے والی۔ میرے درد سے وہ بے چین ہو اُٹھے گی، لیکن اپنے جذبات میں گھٹ کر رہنے کے سوا میرے لئے دوسرا

کیا چارہ ہے! اور وہ سمجھتی ہے مجھے اُس سے محبت نہیں۔ یہی سوچ کر وہ
اُداس ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے لئے میں جو کچھ کرتا ہوں۔ شاید مجھے
نہیں کرنا چاہیئے۔ پھر میری سب خواہشات پر، میرے ہر اقدام پر پہلے سلمیٰ
کا حق ہے، اختیار ہے، پھر کسی اور کا، مگر یہ دوسرے، یہ کوئی اور، نہ جانے
کس طرح میرے ذہن پر مسلط ہو کر رہ گئے ہیں۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں لرزاں
آنسو کے قطرے میں دیکھ سکتا ہوں، دوسروں کی زبان پر میری شکایت ہو
یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کتنا بے بس ہوں میں!

اِس قصّے کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے؟

ذرا ٹھہریئے، مجھے سوچنے دیجئے —— دھندلی دھندلی یادوں کے
سائے میرے حافظے کی دیواروں سے کچھ پرے منڈلا رہے ہیں۔

....میری تین بہنیں تھیں۔ باجی کے بعد میں تھا، اور میرے بعد شیریں
اور نشاط، ہم سب میں بڑی محبت تھی۔ باجی سنجیدہ تھیں، ہماری کھلنڈری
طبیعت انہیں ذرا نہ بھاتی تھی۔ شیریں، میں اور نشاط دن بھر چھت
پر چوکڑیاں بھرتے۔ رات کو قصّے کہانیاں ہوتیں، گیت گائے جاتے، ڈھول
دھنیّا ہوتا —— باجی کمرے میں بند ہو کر ڈھیر ساری کتابیں چشمہ کی اوٹ
سے پڑھتی رہتیں۔ دانشوری کی بات پر اُن کی، ذہنی ورزش شروع ہو جاتی
تکتیں، سوچتیں، غیر معمولی باتوں پر پہلو بدلنا پڑتا۔ کبھی کبھی حیرت سے آنکھیں
بھی پھیل جاتیں۔ امّی حجامن اور مہترانی کو سامنے بٹھائے پاندان سنبھال
سنبھال کر کھولتیں۔ بند کرتیں۔ پان کی گلوریوں پر اڑوس پڑوس کی خبروں

کا رنگ ہونٹوں پر زیادہ نکھر آتا۔

اے مالکن! حمید بابو کی بیگم اتنی کالی کلوٹی نہ ہوتیں تو کیا ہوتا! اے ہے! ذرا فیشن دیکھو! عمر ڈھلنے کو آئی۔ آدھ درجن بچے پیدا کرچکیں اور پوڈر لگاتی ہیں۔ مِسّی پوتتی ہیں!" مہترانی کہتی۔

"مالکن جی! انجینئر صاحب کی لاڈلی۔ اونٹ کی طرح لمبی ہوگئی۔ مگر ذرا بھی شرم نہیں۔ کیسی بے حیائی ہے! دن دھاڑے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے ہونہہ! باوا کے سامنے پردہ کرتی ہیں۔ بی بی جی! اور باوا کے ہٹتے ہی بازاری عورت سے بھی زیادہ بے شرمی! چھی چھی! کیسا زمانہ آگیا ہے! بجامن کان پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں گھما گھما کر یہ کہے جاتی۔ امی صرف ہوں ہاں کرتیں اور پان کا بیڑا آگے بڑھا دیتیں۔ محفل جمی رہتی۔ ہمارے چھوٹے سے گھر میں ہر کوئی شاداں تھا۔ آپس میں اتنی محبت تھی کہ کبھی کبھی تو جی اُکتا جائے! چچا تھے چچی تھیں، اُن کے دل کے ٹکڑے ہمارے بھولی تھے۔ ماحول بڑا پُرسکون تھا۔ ابا بزنس کے سلسلے میں ہمیشہ دور رہتے — کبھی اس شہر میں، کبھی اُس شہر میں ہفتہ دس روز میں گھر لوٹتے تو ہمارے لیے کھلونے، تحفے، میٹھائیاں، سب کچھ لاتے۔ ہم سب اُنہیں گھیر لیتے۔ امی پیار سے ڈانٹتیں۔ "چلو ہٹو، چند منٹ آرام تو کرنے دو۔ دیکھو، دیکھو قمیص پر کالک لگ گئی نا!"

"چھوڑو بھی! بچے ہی تو ہیں! کتنے معصوم ہیں"، ابا شفقت سے ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے۔ پیار سے ہمیں بھینچ لیتے۔

باپ کے پیار اور ماں کی محبّت کا کیا مقابلہ؟ ان کی بے غرض، بے لوث چاہتوں کا ثانی کہاں! شفقتوں کے زیرِ سایہ ہم نے بہت سے خواب دیکھے۔ مگر خواب بکھرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے! ایک چھناکہ ہوتا ہے، ایک بیرحم چیخ اُبھرتی ہے۔ نیند ٹوٹتی ہے، اور خوابوں کے سجے سجائے ایوان سُنسان ہو جاتے ہیں!

ایک ہنستی گاتی رات کی صُبح ہمارے لئے ماتم کدہ بن گئی —— امّی اختلاجِ قلب کی مریض تھیں، ایسی سوئیں کہ ہماری سسکیاں اور کراہیں بھی انہیں بیدار نہ کر سکیں! زندگی میں پہلی بار ہمیں پتہ چلا، خوشی اور غم کے درمیان کتنا کم فاصلہ ہوتا ہے! اس حادثہ نے ہمیں ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ ہم شرارتیں بھول گئے۔ کھیل کود ہمارے لئے اجنبی بن گئے۔

باجی کی ساری سنجیدگی جانے کہاں روپوش ہو گئی! اب وہ ہمارے سامنے ہنستیں مسکراتیں تاکہ ہمارے چہروں پر آئے ہوئے غموں کی گرد دھل جائے۔ بات بات پر وہ کھلکھلا پڑتیں اور ایسا کرتے ہوئے خود اُن کی آنکھوں میں نمی آجاتی، لیکن وہ ہنسے جاتیں۔ زور زور سے قہقہے لگاتیں۔ ایسا لگتا کہ وہ دیوانی ہو گئی ہوں۔ پھر یکایک خاموش ہو جاتیں —— اس طرح جیسے ربر کے غبارے میں ہوا زیادہ ہونے کی وجہ سے اُس کے پرخچے اُڑ گئے ہوں! ہمیں چمٹا چمٹا کر پیار کرتیں۔

امّی کی جگہ باجی نے لے لی۔ زخم بھرتے گئے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ ہماری زندگی میں جو خیلیج

پیدا ہو گئی تھی وہ وسیع اور وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ ہم کئی بھول بھلیّوں سے دوچار ہوئے۔ نئے مسائل سامنے آئے۔ نئی راہیں ملیں۔ ابّا نے اپنا کاروباری مرکز ہانگ کانگ کو بنایا۔ وہاں اُن کے کئی دوسرے پارٹنرز پہلے سے موجود تھے۔ ہم سے جدا ہوتے وقت ان کا گلا رُندھ گیا تھا۔ پیار کے چند بول بھی ٹھیک سے نہیں کہہ سکے۔

"گھر امانت، میرے بچو! میں نہیں تو کیا ہوا۔ تمہارے چچا جو ہیں۔ چچی ہیں ـــ تم سب بھائی بہن ہو۔ تمہارے چچا کے بچے ہیں۔ سب لوگ مل جُل کر رہنا اور ـــ میں برابر آتا ہی رہوں گا۔ پھر تمہیں بھی ساتھ لے چلوں گا۔"

اُف یہ ساتھ جانے کی بات! اس کے لئے تو ہم ساری عُمر ترستے رہے ہیں اب تک ہمیں ابّا کا انتظار ہے، لیکن وہ نہیں آئے، صرف اتنا معلوم ہے کہ ہانگ کانگ میں پہلے اُن کا کاروبار کافی چمکا۔ اُمید سے زیادہ منافع ہوا۔ کچھ اور پلان بنائے گئے۔ افریقہ کے سیاہ براعظم میں بھی ابّا نے قدم جمانے شروع کردیئے ترقی ہوئی۔ ہمتیں بڑھیں۔ تجارت کو فروغ ملا۔ اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ کہ سب کچھ ختم ہو گیا ـــ دھیرے دھیرے سب بزنس چوپٹ ہو گیا۔ ابّا لاپتہ ہو گئے۔ ہمارے سارے خطوط ڈیڈ لیٹر آفس کی مُہریں اپنے سینے پر چسپاں کئے ہمارے پاس لوٹ آئے۔

ہمارے تمام خواب بکھر گئے۔ دوسروں کی نظرِ کرم کے سہارے کوئی کب تک ستاروں پر کمند پھینکتا رہے۔ چچا اور چچی کی شفقتیں ہمارے لئے بڑی نعمتیں تھیں، لیکن جب اپنے لختِ جگر نگاہوں کے سامنے ہوں تو دوسروں کے بچّوں کی

وقت کم ہو ہی جاتی ہے۔ کہنے کو ہم سب بچے اُن کے اپنے بچوں کے مانند تھے لیکن ہر جگہ امتیاز، ہر قدم پر فرق کیسے چھپایا جا سکتا ہے بھلا! ہم سب کچھ دیکھتے، سنتے، محسوس کرتے اور خاموش رہ جاتے۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟

وقت بھاگتا گیا۔ ناسمجھی اور ضد کی حدوں سے نکل کر ہم فہم اور شعور کے احاطے میں پہنچ گئے۔ باجی تو شروع سے سنجیدہ تھیں۔ زمانے کی رفتار نے ہم سب کو ہی سنجیدہ بنا دیا۔ سہم سمٹ کر رہنا، تلخ سے تلخ بات برداشت کر جانا۔ تھپڑ کھا کر رونا بھی نہیں۔ صرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنا ہم نے سیکھ لیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایسا لگتا کہ جیسے بچے ازل ہی سے فلسفی پیدا ہوتے چلے آ رہے ہوں!

ماں باپ کے بعد چچا چچی نے ہماری سرپرستی کی ـــــ مگر ان کی محبت میں خلوص کی تابانی نہیں تھی۔ ایسا لگتا وہ لوگ جو کچھ ہمارے لئے کر رہے ہیں وہ اگر نہیں کریں تو ہم مر مٹ جائیں گے۔ میں اپنے احساسات بتاتا ہوں ـــــ چچا نے جب کبھی مسکرا کر میری طرف دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے اُن کی مسکراتی آنکھوں کے پیچھے تیر کمان تنے ہوئے ہوں۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں کو سن کر مجھے اکثر کپکپی آ جاتی۔ ایک انجانا خوف سا محسوس ہوتا۔ اور ڈر کی وجہ؟ جانے کیا کچھ؟ کبھی کسی نتیجہ پر میں نہیں پہنچ سکا۔ ان کی شفقتوں کے لمس پر مجھے ہمیشہ گھٹن سی محسوس ہوئی۔

عورت کا دل تو عبادت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اُس کے تقدس کے آگے

ہمارے سر خود بخود جھک جاتے ہیں۔ چچی نے ہمیں پیار دیا، لیکن وہ احساس کہ اس پیار، اس محبت پر ہمارا پیدائشی حق ہے، کبھی نہیں پیدا ہو سکا۔ چچا کے سب بچے ــــ خالد، ماجد اور سائرہ ہمارے اپنے بھائی، بہنوں سے چھوٹے تھے۔ لیکن ہمیں اُن سے بھی خوف لگتا ہم محسوس کرتے کہ ہمارے بزرگ ہیں۔ ہمیں اُن کا احترام کرنا چاہیئے، ہم سے کسی نے محبت نہیں کی۔ کسی نے خلوص نہیں دیا۔ سب نے صرف مہربانی کی۔ جو کچھ کسی نے کیا وہ ہماری، بے بسی پر ترس کھا کر!

جیسی بھی رہی ہو۔ ہماری زندگی چچا، چچی کے رحم و کرم پر آگے بڑھی۔ باجی بیاہی گئیں۔ تنویر، ہی اور نشاط بھی ازدواجی دھاگے میں۔ بندھ گئیں۔ کامرس میں گریجویٹ ہونے کے بعد اسٹیٹ بینک میں میری تقرری ہو گئی۔ پھر سلمیٰ میری ویران سی دنیا کو لالہ زار بنانے چلی آئی۔ سانولی سلونی سی کتابی چہرے والی معصوم سی دوشیزہ سلمیٰ ــ اسے دیکھ کر اپنے سارے درد بھول جانے کو جی چاہتا ہے لیکن اپنی ذہنی روش کو کیا کروں؟ سلمیٰ کے سامنے بھی پوری طرح نہیں کھُل پاتا ہوں، اس سے بھی بہانے بناتا ہوں۔

خالد اور ماجد بڑے ہو گئے ہیں۔ سائرہ کی شادی بھی پچھلے برس ہو گئی مگر ان کی فرمائشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ چچا اور چچی بھی آئے دن کسی نہ کسی چیز کی خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مجھے سب کا دل رکھنا پڑتا ہے۔

"میرے لئے لپ اسٹک لا دیجیئے گا اور ہاں لیکٹو کلامائن کی ایک شیشی بھی۔" سائرہ کہتی ہے۔

میرے لئے فاؤنٹین پن خرید دیجئے۔" ماجد فرماتے ہیں۔

"بھائی جان، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس اگفا کمپنی کا ایک کیمرہ لے دیجئے قیمت ہے صرف پچیس روپئے!" یہ فرمائش خالد میاں کی ہے۔

"بیٹے!" چچا نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے "میرے لئے تین گز ٹویلین خرید کر پارسل کر دو اور تمہاری چچی کے لئے ایک شال بھی چاہیئے۔ اپنی پسند سے لیکر بھیجدو۔

اور سلمیٰ گم سم رہتی ہے۔ اس کی کوئی خواہش نہیں، کوئی فرمائش نہیں۔ میں ہزار پوچھتا ہوں ——— کچھ بھی کہو، تمہارے لئے اس یکم تاریخ کو کیا لا دوں ——— کوئی بھی نئی چیز۔؟"

وہ ہنستی ہے ——— "مجھے کچھ نہیں چاہیئے اپنے لئے اس سال نیا سوٹ بنوا لیجئے!"

میں چاہتا ہوں سلمیٰ کے لئے کوئی تحفہ خرید دوں۔ مگر دوسروں کی فرمائشوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔ سارے پیسے ختم۔ اُدھر سے کتنے سارے لوگوں کے قرضے! کبھی کبھی میرے بیجا اخراجات سے گھبرا کر وہ کچھ بک دیتی ہے۔ روٹھ بھی جاتی ہے۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ سائرہ نے عین تنخواہ سے دو روز قبل ایک ریسٹ واچ کی فرمائش کر دی۔ کسی سہیلی کی سالگرہ پر دینی تھی۔ میں اس کی بات ٹال نہیں سکا۔ کپڑے والے کے پیسے اُدھار ہی رہے۔ سلمیٰ خوب بڑی ناراض ہو گئی۔ اب مجھے ستا رہی ہے۔ اس خاموشی سے اُکتا گیا ہوں۔ تنہائی کے احساس

سے میرے دِل میں ٹیس اُٹھ رہی ہے۔ میں سلمیٰ کو جھنجھوڑ دیتا ہوں۔

مجھے ساری دُنیا سے نفرت ہے سلمیٰ مجھے تم سے محبت ہے۔ صرف تم سے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں۔ تُم بھی روٹھ گیئں تو پھر میں کہاں جاؤں گا۔ ہم وفا کی روایت کے ہاتھوں لُٹ گئے۔ تو کیا ہوا، آؤ اپنی آئندہ نسل کے لئے ایک خواب دیکھیں۔ اُنہیں پابند وفا ہونے سے بچالیں۔ آؤ ہم دیکھتے رہیں دوسروں کے رحم وکرم کی آنچ اُنہیں جھلسنے نہ پائے۔

"اونہہ ..... ہوں ..... ہوں"۔ چند سسکیاں اُبھرتی ہیں۔ میرے رخسار پر گرم جھرنے رواں ہیں میری رُوح روشنی میں نہا گئی ہے۔ اس روشنی میں بہت ٹھنڈک، بہت خنکی ہے۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ جیسے ابھی اُچھل کر حلق سے باہر چلا جائے گا

ہر طرف سناٹا ہے خاموشی ہے!

ہر طرف، ہمت بہار ہے، شگفتگی ہے!

کاش یہ لمحے جاوِداں ہوتے!!

★★

آنکھ مچولی

ذرا سوچیے وہ کون سی بات ہو سکتی ہے ؟

وہی ایک بات انیل کے جی میں اکثر آئی۔ اُس نے چاہا اُسے باندوں میں لے کر، اُس کی آنکھوں میں کھو کر، سرگوشی کرے . . .

اکثر اُس کے سامنے ہی مونا کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

انیل نے سوچا جیسے وہ کانپتے ہوئے ہونٹ نہ ہوں، بلکہ کسی چراغ کی سُرخ لپکتی ہوئی لَو تھرتھرا کے رہ گئی ہو! انیل نے چاہا مچلتی ہوئی اُس لَو کو اپنی انگلیوں سے چھُو لے۔ ہتھیلیوں میں تھام لے۔

مونا کے ہونٹوں میں کچھ تو گلاب کا دہکتا ہوا رنگ تھا۔ کچھ لپکتے شعلوں کی چمک اور کچھ شبنمی قطروں کی جھلملاتی تازگی، شگفتگی۔ سامنے ذرا ذرا اُبھار تھا۔ نچلوں میں ذرا ذرا خم، کتنی ہی باریک، ہلکی شکنیں پھیلی ہوئی تھیں وہ شکنیں ویسی ہی تھیں۔ جیسے شام ڈھلے ڈوبتے سورج کی تڑپتی ہوئی کرنیں!

یوں مونا کی آنکھیں بولتی بھی تھیں، چنچل بھی تھیں۔ اُس کے رخساروں میں سُرخی بھی تھی۔ آنچ بھی تھی۔ لیکن انیل کے مطابق اُس کی شخصیت

کی ساری کشش، ساری جاذبیت اُس کے ہونٹوں سے شروع ہو کر ہونٹوں پر ہی ختم ہوتی تھی۔

مونا کی سُبک رفتاری ویسی ہی تھی۔ جیسے جھیل کے ساکت ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینکنے سے لہروں کے دلفریب دائروں کے سلسلے پے بہ پے اُبھر رہے ہوں، پھیل رہے ہوں۔ سامنے کے اعضا میں طوفان مچلتے اور وہاں پیچھے اُمڈتی، دھڑکتی تھرکنیں ہوتیں —— انیل کی نگاہیں مونا کے انگ انگ پر پھسلتی رہتیں۔ اِس پل یہاں۔ اُس پل وہاں۔ اُن طوفانوں کی شدت کم ہوتی۔ نہ اِن بیتاب نگاہوں کی چاہت۔ اِدھر بھی تڑپ، اُدھر بھی بے قراری۔

مونا کے نکھرے نکھرے پیکر سے خوشبوئیں اُبلتیں، بکھرتیں اور انیل کے تمام جسم میں چنگاریاں سی سُلگ جاتیں، دہک جاتیں۔ زلفیں کھولے، کجلائے نینوں میں دیپ جلائے، مسکراتی۔ بل کھاتی، لچکتی ہوئی وہ سامنے آتی۔ تنتی، جھکتی، بانہیں اُٹھا کر انگڑائیاں لیتی۔ انیل کو محسوس ہوتا جیسے کوئی مہتابی، کوئی پھلجھڑی چھوٹ گئی ہو۔ کوئی تیز جھونکا آیا ہو اور شاداب گلاب کی پنکھڑیاں گردو پیش میں چھا گئی ہوں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مونا کا آنچل ڈھلک جاتا۔ ایک لمحے کے لئے انیل کی نگاہوں میں قوسِ قزح کے سارے رنگ جذب ہو جاتے۔ چمکیلی سنہری تتلیاں رقص کرتیں۔ وہ کھو جاتا —— جیسے یہ نظارہ۔ نظروں کی یہ جنت۔ تمام عمر، ساری حیات کی تمنّا ہو۔ ماحصل ہو!

انیل جب فردوسِ نظر میں گم ہوتا مونا کی رگوں میں شہنائیاں سی بج اٹھتیں اپنے آپ کو ہلکی ہلکی محسوس کرتی۔ ایسا لگتا جیسے ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی پھر رہی ہو۔ اس کے تنے تنے اعضا، اچانک ڈھیلے پڑ جاتے۔ ہتھیلیاں گرم ہوجاتیں ہونٹ تپنے لگتے۔ لَویں جلنے لگتیں۔ ایک مدھم مدھم سرور اُس کی آنکھوں کو گلابی بنا دیتا۔ اُس کے رخساروں میں سُرخی نمایاں ہو جاتی۔ سارے جسم میں شعلے سے لپک جاتے۔ ایسے میں، وہ چاہتی کوئی اُسے اپنی باہوں میں کس لے۔ جکڑ لے۔ دبوچ لے۔ ان تپتے ہوئے ہونٹوں کی تپش کوئی اور بڑھا دے۔ اِن جلتے ہوئے رخساروں کو کوئی اور بھی جلا دے۔ یہ آگ کسی اور آگ سے ہی بجھ پائے گی!

انیل کی سانسوں میں بھی ہل چل مچی ہوتی ـــــ اس کے سراپا میں بھی ایک ارتعاش ہوتا۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے اس کے سینے میں کوئی دل نہ ہو۔ اس دل کی دھڑکنیں نہ ہوں۔ بلکہ کوئی پنچھی ٹھہر ٹھہر کر اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہا ہو۔ اُس کی نسوں میں اینٹھن سی ہونے لگتی۔ اُس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگتے۔ پلکیں کھُلی رہتیں لیکن سامنے کچھ بھی نظر نہ آتا۔ دھندلاہٹوں میں اِدھر اُدھر صرف چنگاریاں سی اُڑتی ہوئی معلوم ہوتیں۔

مونا کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بڑی سی سُرخ بندیا۔ اُس کی ناک میں دمکتی ہوئی فیروزی ہیرے کی کنی، گلے میں سفید موتیوں کی لڑیاں، بیلے کی دو کلیوں سے بچی اُس کی نازک لَویں، جوڑے میں کھلتا مسکراتا ہوا گلاب ـــ یہ سب انیل کی خواہش اُس کی چاہت کے مطابق ہی تھا۔

انیل کو کچھ خاص رنگ ہی پسند تھے جیسے زرد، چمپئی یا ہلکے شفق کا رنگ، کاسنی، فالسئی، پستئی، سبز یا تر و تازہ گلاب کی ٹہنیوں کا رنگ۔ مونا اپنی پوشاکوں میں انہیں رنگوں کا انتخاب کرتی۔ مونا کے لئے یہ شوخ لیکن بیجان رنگ صرف رنگ نہ تھے، انہیں رنگوں میں تو انیل کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں!

پوشاکوں میں بھی انیل کی اپنی پسند تھی۔ اُسے یا تو چست پاجامے اور بڑے بوٹوں، کھلے آستینوں والے کرتے اچھے لگتے یا پھر غرارے، جمپر اور کامدانی ڈوپٹے۔ مونا انہیں پوشاکوں کو ترجیح دیتی۔ سفید ساڑیاں بھی دونوں کو بہت بھاتیں۔

انیل نے ایک بار کہا تھا۔

عورت تو قدرت کا ایک حسین نظارہ ہے...... اُسے فطرت کے قریب ہی رہنا چاہیئے۔ کانوں میں جھولتے ہوئے بڑے بڑے ٹاپس، ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کی طرح بڑے بھدے کنگن، گھڑی کے پنڈولم کی طرح ماتھے کے ٹیکے سفید بلوریں گردن کو بے رحمی سے جکڑے ہوئے طلائی جڑاؤ گلوبند........ عورت کا فطری حسن چھین لیتے ہیں۔ ــــ عورت تب عورت نہیں رہ جاتی۔ ہاں عجائب گھر میں رکھی ہوئی آثار قدیمہ کی کوئی یادگار مورتی ضرور بن جاتی ہے۔

مونا تو ایسی نہ تھی ــــ سادگی سے اُسے خود لگاؤ تھا۔ دیسے پھولوں، گجروں سے آراستہ ہو کر باغ و بہار ضرور بن جاتی۔ اپنی خوشبو سے آپ مست ہوتی۔ دوسرے بھی سرشار ہوتے۔ یہی تو ہے وہ قدرت کا حسین منظر، دلکش نظارہ...... یہی...... یہی...... یہی...... اسی سے تو چراغوں میں

میں روشنی ہے. ستاروں میں ضیاء ہے. آفتاب کی کرنیں اسی سے مستعار ہیں. چاند کی شعاعیں اسی سے مستفیض ہیں. ہلکی ہلکی یہ فضا اسی کی مرہون منت ہے مونا..... مونا..... مونا..... میری جان!! ویرانوں میں، بہاروں میں اُسے ہر سمت وہی نظر آتی ــــ وہ مونا لیزا تھی، نہ قلوپطرہ، نہ زلیخا! ــــ وہ مونا تھی، بے نظیر، بے مثال!!

آئینے کے روبرو جب وہ بیٹھتی اپنی آنکھوں میں اُسے انیل کے سائے ہی نظر آتے، وہی ہلکی ہلکی نظریں. وہی البیلی ہنسی پُر اسرار مسکراہٹیں، وہی کسک سی ہونٹوں پر! ــــ مونا تڑپ جاتی. دانتوں تلے ہونٹوں کو دبا لیتی. اپنے سارے اعضاء میں تناؤ سا محسوس کرتی. پل بھر میں اُس کا سارا جسم تپنے لگتا. آپ ہی آپ اُس کی پلکیں مُند جاتیں. اک ٹھنڈی سانس لیتی. سرد آہ بھرتی. انیل.... انیل..... انیل!!

جانے کیوں اپنی دھڑکنیں وہ سنبھال کر رکھتی ــــ ہونٹوں سے پھسلی ہوئی یہ آہیں کوئی سن نہ لے، مجحوب سی یہ آنکھیں کوئی دیکھ نہ لے، میری مضطرب سی تمناؤں کو کوئی محسوس نہ کر لے.... کوئی نہیں، وہ بھی نہیں..... انیل بھی نہیں!!

★ ★

صنم آشنا

سارا دِن ہوا تیز تیز چلتی رہی تھی۔ فضا گرد آلود ہو گئی۔ شام ڈھلے ہی کامنی غسل خانہ سے نکلی ——— دیر تک گلیسرن سوپ کے ملائم جھاگ کو پورے بدن پر ملتی رہی تھی۔ خموں، شکنوں اور اُبھاروں پر ہاتھوں کے لمس سے گدگدی پیدا ہو جاتی۔ کبھی انگڑائیاں لیتی۔ کبھی خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتی لمحہ بھر کے لئے کانپ جاتی۔ تولیہ میں جسم کی نمی جذب کرنے کے بعد تازہ دم ہوئی۔ لیکمے ٹالک سارے بدن پر چھڑک کر جلد کی چکناہٹ ہتھیلیوں سے محسوس کرتی رہی۔ کیسی مدہوش کن ترنگیں اُبھریں۔ پلکیں بوجھل ہو جائیں۔ تمام انگوں میں تھرکن سی ہوتی رہتی۔

فیشن کے رسالوں سے افزائشِ حسن کے طریقے سیکھنے، آزمانے کا کامنی کو بہت چاؤ تھا۔ مختلف اقسام کے کاسمیٹکس، سینٹ اور دیگر مصنوعات کا ذخیرہ جمع کئے رہتی۔ ہر دم اُس کی مساموں سے ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں اٹھتی تھیں۔ مساج کرنے کے بعد حوض کے پانی میں ایوڈی کولون کی آدھی شیشی تحلیل کر کے نہاتی۔ اُس سے اُسے بہت فرحت ملتی تھی۔ کافی اہتمام سے اپنی نوک پلک وہ سنوارتی۔ عضو عضو پر کریم، پاؤڈر کی تہیں چڑھی

رہتیں۔ کوَر مارک کریم، این فریخ ڈیپ کلینزنگ مِلک پونڈس انجل فیس کے مادّے اُس کے چہرے کو گلنار کر دیتے۔ میکس فیکٹر کی لپ اسٹک اس کے ہونٹوں کو سُرخ گلاب بنا دیتی۔ فطرتاً اُس کے ہونٹ ذرا سے وا ہوتے۔ اس سے دہانہ کی رونق بڑھ جاتی۔ لبوں کی طراوٹ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا گویا شبنم کی حلاوت سے گلاب کی پنکھڑیاں پھیل رہی ہوں۔ سفید سفید دانتوں کی لڑی ایک خاص تاثر چھوڑتی۔

معمول کے مطابق ریشمی ملبوسات زیب تن کرنے سے قبل ڈریسنگ کے آئینے کے روبرو اپنے پیکر کا وہ جائزہ لے رہی تھی۔ الگ الگ زاویوں سے گھوم پھر کر اپنے سراپا کی کشش کا اندازہ کرتی۔ ڈائے ٹنگ اور مخصوص ورزشوں سے اپنے جسم کو اُس نے متناسب بنا لیا تھا۔ مستند اعداد و شمار کی بنیاد پر وہ ہمیشہ خود کو ناپتی تولتی رہتی۔ کمر پتلی تھی۔ کولھے انتہائی خمیدہ تھے۔ باہیں گدرائی تھیں۔ سینے کا اُبھار معقول تھا۔ پنڈلیاں، سڈول تھیں وہ اپنی ٹانگوں کا موازنہ ریٹا فاریا کی ٹانگوں سے کرتی۔ اپنے دہکتے رخسار کا مقابلہ یاسمین داجی کے عارض سے کرتی۔ بازو لہرا کر محسوس کرتی پرنسس کمباٹا کی باہیں ایسی ہی تو ہیں۔ اُس کی ناک کی نوبیں ممتاز کے نتھنوں سے مشابہہ تھیں۔ آنکھیں نیرہ میرزا کی طرح نشیلی تھیں۔ اُس کے کولھوں پر ہیلن کے کولھوں کا گمان ہوتا۔ کچھ لچک کر، کچھ جھول کر اپنی رعنائی کا باریک بینی سے وہ تجزیہ کرتی تھی۔ بال و ناخن تک کی آرائش پر خاص توجہ دیتی۔ بھویں پتلی اور کمان نما ہوں۔ پپوٹے بھاری بھاری لگیں۔ کاجل ذرا پھیل جائے۔ آنکھوں میں تری

رہے۔ چال میں مستی اور لڑکھڑاہٹ! زیبائش سے متعلق موضوعات پر کتنی کتابیں اُس نے پڑھی تھیں۔ بیوٹی ایکسپرٹ سے صلاح لی تھی۔ بتعینہ اوقات میں میڈیکل چیک اَپ بھی کراتی۔ بہت اعتماد سے وہ سوچتی —
میری جلد پر کوئی میٹ مِٹا سا نشان بھی نہیں پورا جسم شیشے کی طرح چمک رہا ہے۔ ہاں، وہ دائیں جانب گال پر ایک سیاہ تل ہے، وہ تو بیوٹی اسپوٹ ہے۔ بالکل نیچرل، ہاؤ فیسی نیٹنگ! جاذبیت کیلئے عورتیں نقلی تل بناتی ہیں۔ فولس! گلیمر کہاں سے لائیں گی؟

سبز لیڈی ہیملٹن کا بلاؤز جس کا کنارا براسیئر کے بارڈر سے تھوڑا ہی نیچے تھا۔ دھانی رنگ کے میسور سلک کی ساڑی پر خوب پھب رہا تھا۔ گریبان کھلا تھا۔ تنے تنے بالائی حصے پر لباس منڈھ دیا گیا تھا۔ جوبن کی لرزش عیاں تھی۔ ساڑی کو دو انچ سے بہت نیچے کولہوں کے اُبھار پر بیٹھی۔ پیٹ اور کمر کا یہ برہنہ حصہ کافی دلفریب بن جاتا۔ کمر کی خمیدگی سے کولہوں کے خطوط اور زیادہ دلکش لگتے۔ ایک خاص ادا سے آنچل گرا گرا کر سنبھالنے کا مشق چابک دستی سے کر چکی تھی۔ جیسے ہی آنچل سرکتا اُس کے تو بدن سے شعاعیں پھوٹ جاتیں۔ فضا مہک اُٹھتی۔ مقابل کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ خمار چھا جاتا۔ کامنی دلربائی سے مسکراتی۔

"اوہ! ویری ٹربل سم!"

ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کر دوسرے سے آنچل کاندھے پر سجاتی۔ ناخنوں پہ کیوٹیکس انگاروں کی طرح دہکتے۔ فورفنگر میں پھنسی ہوئی طلائی انگوٹھی کا

جاکیٹی امی شیشن جگمگا اٹھتا۔ اُس کی داہنی کلائی میں جگ مگ کرتے ہوئے چھوٹے
نگینوں سے مزین ایک بریسلیٹ تھی، بائیں میں سنہری زنجیر والی ایک چوڑی گھڑی
کانوں میں جھولتے ہوئے لانبے آویزے کرنیں بکھیرتے۔ گلا بند پر بڑی خوبصورت
نقاشی تھی۔ عموماً بالوں کو سامنے سے اُٹھا کر، کھینچ کر اُوپر پیرامڈ کے اسٹائل
میں لپیٹی تھی۔ ایک دو لٹیں رخساروں پر سایہ فگن رہتیں۔ ہونٹوں کو دبا کر
مُسکراتی۔ نگاہوں میں شوخیاں مچلتی تھیں۔

کرسچن کیلر والے ڈاکٹر وارڈ نے ایلزبتھ ٹیلر کو جی سیلڈ بیوٹی اور صوفیہ
لارین کو سوفسٹی کیٹیڈ بیوٹی کے نام سے موسوم کیا تھا۔ کامنی خود کو ایکس پلوزیو
بیوٹی تصور کرتی تھی۔ اپنی اس اصطلاح پر اُسے بہت ناز تھا۔ اُس کا شباب کچھ
ایسا ہی تھا۔ ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہوا۔ نس نس میں چنگاری سلگتی ہوئی۔ بچپن
سے ہی وہ موہنی سی تھی۔ پپا اُسے موم کی مورت کہتے تھے، ممی جاپانی گڑیا۔ جبکہ وہ
بہت چھوٹی سی تھی۔ اُن دنوں سے ہی اُسے آئینہ کے سامنے بیٹھنے، کھڑے ہونے
کا چسکا لگا تھا۔ اپنی صورت کو وہ تکتی رہتی، ہنستی، مسکراتی۔ بار بار اپنے عکس کو چوم لیتی۔
سیانی ہوئی تو خدوخال کے بدلتے رنگ روپ اُسے اور بھی متحیر کرنے لگے۔ مبہوت ہو کر
ہر اُبھار، ہر خم، ہر گوشے کو دیکھتی، چھوتی، محسوس کرتی۔ کبھی فکر کی بھول بھلیوں میں
کھو جاتی۔ کچھ وسوسے، اندیشے کلبلاتے۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کپکپی طاری ہوتی۔
پھر جھوم اُٹھتی۔ جی چاہتا وارفتگی سے اپنے آپ کو بھینچ لے۔ خود پر بے اختیار پیار
آ جاتا۔ اُس کے کومل کومل انگ اُسے گدگدا دیتے۔ اُف! کتنی حسین ہوں میں،
کتنی سبک! رانیں ایسی سپید اور چکنی جیسے مکھن کے لوندے! صندلیں بانہیں،

ہونٹوں سے رس ٹپکے۔ آنکھوں میں ستارے جھلملائیں۔ جس کی گردن میں باہیں ڈال دوں، نشے میں جوڑ جوڑ ہو جائے۔

اُس کے رگ و پے میں طمانیت کی لہریں پھیلنے لگتیں۔ کامنی کی قربت کے صرف لمس سے ہی ہیجان کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے تھے۔ اُسے ڈرائیونگ اُسی نے سکھائی تھی۔ اُس کی پنڈلیوں کا سجیلا پن اور بازوؤں کا گداز محسوس کر کے لرز لرز جاتا۔ شاہراہوں پر ٹیرکس۔ یوکلپٹس، ایلٹو اور پائن کے درختوں کے بیچ اپنا حلقہ تنگ کرنے لگتا۔ بالکل دبوچ لیتا۔ کامنی ذرا کسمساتی۔

ایکسیڈنٹ کراؤ گے کیا؟ اونہہ! ٹھیک سے بیٹھو نا"

"اسٹیرنگ سنبھالو"

"ارے، ارے، گیئر تو بدلو"

کامنی کو پھولوں سے بہت اُلفت تھی۔ خصوصاً گلیڈ یولا، ڈیلیا، اور سوسن اُسے بے حد اچھے لگتے۔ اپنے کمرے میں جگہ بہ جگہ گلدستے سجاتی۔ پھولوں کی دلنواز رنگت اُس کی نظروں کو سرشاری بخشتی تھی۔ بیڈ بیس پر فریموں میں اُس کی بہت سی تصویریں لگی تھیں۔ گلاب کی شاخیں تھامے ہوئے۔ جھیل میں کشتی پر پانی سے کھیلتے ہوئے۔ برف پر اس کے ٹنگ کرتے ہوئے۔ ٹینس ریکٹ سے گیند پر تان لگاتے ہوئے ——— سب یادگار فوٹو تھے۔ متبسم چہرے کی صباحت ساری تصویروں میں برقرار تھی اسی لئے تو ممی اُس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہتی تھیں۔

"ہاؤ ہیلس! سو پرٹی فوٹو جینک!"

جانے کیوں ممی کی اِس بات پر اُسے بملا کی یاد آجاتی تھی۔ وہ عجب شاتون

پر کھلے بال بکھرائے سبزے پر اٹھلاتی پھرتی ہاتھ اوپر اٹھا کر بالوں میں اسکارف لپیٹتی ہوتی، لاؤنج میں بید کی کرسی پر غنودگی کی حالت میں نیم دراز ہوتی ہمل کیمرے کا اینگل ٹھیک کرنے لگتا۔

"پلیز ڈون اسنیپ!"

"تھوڑی ذرا اوپر گھمائیے۔"

"مسکرائیے نا!"

"تھینکس!"

اور ایک وہ تھا کملیش! اس نے کامنی کو کافی متاثر کیا تھا۔ ناٹ گارڈن میں جب اُس کا مرمریں بدن جھل جھل کرتا ہوتا اسکارچ کے دوسرے پیگ میں اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور چاندی کے پائپ میں گولڈ فلیک کے کش کھینچ کردہ دھوئیں سے دائرے بناتا ہوا کملیش اُسے سامنے بٹھائے کسی نئی پینٹنگ کے خاکے ذہن میں مرتب کرتا۔

"اب ختم بھی کرو اپنی یہ تصویرکشی، روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ بتی بجھاؤ گڈ نائٹ!"

کملیش نے اُس کے کتنے سارے اسکیچ بنائے تھے۔ اُس کی وہ لائف سائز پورٹریٹ بھی جو ڈرائنگ روم کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔ کملیش کو اُس کی نقرئی ہنسی بہت بھاتی تھی۔ بس ایسے ہی اُسے چھیڑتا۔ قہقہے لگاتا۔ کامنی بھی کھل اُٹھتی۔ اُس کی آنکھوں کی جنبش، ہونٹوں کی سلوٹیں، رخسار کی آنچ۔ جبیں کی تابندگی اور شفق سب کینوس پر منقش ہو جاتیں۔ سگار کا

سُرمئی دھواں اُس کی لہریئے دار زلفوں میں اُلجھا کر زور زور سے تالیاں بجاتا۔

"گلیمرس! گلیمرس!"

"یہ کیا حرکت ہے؟ نان سنس!"

"گڈ گاڈ! سو بلینٹ، سو ایکسائی ٹنگ!"

پہلی دفعہ ویک اینڈ پر وہ سمندر کے کنارے ایجائے کر رہے تھے۔ تیرا کیے۔ دھوپ غسل کرتے رہے۔ ریت سے، موجوں سے کھیل کھیل کر وہ کافی تھک گئے۔ کملیش کو انہیں لمحوں میں ایک خیال سوجھا تھا۔ تجویز سن کر کامنی پہلے سٹپٹائی نتھنے سکوڑتی رہی۔ تیوریوں پر بَل ڈال کر کیا کیا سوچا۔ پھر راضی ہو گئی۔

"اسکن خراب نہیں کرو گے، ہاں!"

"گاڈ بلیس می! مجھ پر بھروسہ رکھو میڈم!"

"بت بنی وہ کھڑی رہی۔ کملیش نے اُس کے شکم پر کئی خوشنما بوٹے پینٹ کیئے جن سے منسلک بیل اوپر اور نیچے پھیلتی چلی گئی تھی۔ دیر تک اپنے اعضا پر وہ نظریں جمائے رہی۔ یکایک خوشی سے اُس کی چیخ نکل گئی۔

"یو آر گریٹ آرٹسٹ ــــــ ویری ویری گریٹ!!"

★ ★

ایک دِن کا سَفر

صبح ——

چلتے چلتے ایک بار پھر میں نے جیب سے رادھا کا خط نکالا۔ رادھا کے الفاظ تو ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں، مگر جلد ہی۔ آپ مجھ سے اس پتہ پر ملئے۔

ڈاکٹر رادھا اصراف

۱۷۔ ایم۔ او، فلیٹ

پی، ایم، سی، ایچ۔

دیکھو جلدی ہی آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

—— رادھا

میں نے خط شمس کو دیا۔ اس نے پتہ دہرایا۔ پھر کہا۔

"آیئے دریافت کرتے ہیں۔"

ہم نے روڈ کراس کیا۔ زناٹے سے ایک کار گذر گئی۔ دوسری آئی، قریب ہی پارک کر لی گئی۔ ہم میڈیکل کالج کیمپس میں داخل ہو رہے تھے۔ پیچھے سڑک جاگ پڑی تھی۔ آگے بھی زندگی کے آثار تھے۔ مگر مدھم! کسی بھی ہسپتال کے اردگرد جانے کیوں

میں زندگی کی بے بسی شدت سے محسوس کرتا ہوں!

نیا پیک کھول کر ایک پیپیر مِنٹ چکلیٹ میں نے شمس کو دیا۔ ایک خود بھی لیا۔ مُنہ کی ایکٹی ویٹی ایک عادت سی بن گئی ہے۔ سگریٹ بھی پیتا ہوں۔ رادھا منع کرتی ہے اس لئے کبھی ترک کرتا ہوں، پھر کبھی شروع کر دیتا ہوں۔

چکلیٹ چباتے ہوئے شمس نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ ڈاکٹر مایا صراف کون ہیں؟ رادھا سے اُن کا کیا رشتہ ہے؟"

پتہ نہیں، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم رادھا یہاں کب اور کیوں آئی ہے تشویش ہو رہی ہے۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ پاگل لڑکی ہے۔ کیا کیا سوچتی رہتی ہے"

سامنے سے آتے ہوئے ایک آدمی کو روک کر شمس نے پوچھا

"بارہ نمبر ایم، او، فلیٹ کدھر ہے؟"

"اِس سڑک سے گذر کر، اُس درخت کے پیچھے وہاں جائیے۔ اُس کمپاؤنڈ میں؛"

ہر فلیٹ پر ہم نمبر ڈھونڈتے رہے۔ نیم پلیٹ پڑھتے رہے۔

ڈاکٹر ایم۔ الیف، رحمٰن۔

ڈاکٹر راجندر بھاٹیہ۔

ڈاکٹر مسز بی، کے، مینن۔

ڈاکٹر مس کامنی۔

ڈاکٹر سنگھ۔

ڈاکٹر سریواستو۔

ڈاکٹر مایا صراف کہاں تھیں؟

ایک جگہ پہنچ کر شمس نے دریافت کیا۔

"اس فلیٹ کا نمبر؟"

"تیرہ" جواب ملا۔

"بارہ کدھر ہے؟"

"اُدھر پوچھیے"

کمپاؤنڈ میں ایک بوڑھا پہرہ دار نظر آیا، خاکی پوشاک میں۔ شمس نے پوچھا۔

"ڈاکٹر مایا صراف کہاں رہتی ہیں"

"پتہ: ۱۲، نمبر ایم، او، فلیٹ"

"ایم، او، فلیٹ اِدھر سامنے ہے۔ اُس میں بارہ نمبر تو نہیں! اُدھر پے ئنگ وارڈ ہے، اُس میں بارہ نمبر ہے۔ اُدھر سے جائیے"

ایم، او، فلیٹ میں پہلی منزل سے چوتھی منزل تک، نیچے بند کمروں سے اُوپر کھلے آسمان تک ہم تینوں بار گئے۔ پے ئنگ وارڈ سے جنرل وارڈ تک کئی چکر لگائے۔ مگر ڈاکٹر مایا صراف تو بالکل پُراسرار تھیں۔

پھر شمس کے ایک ملاقاتی ڈاکٹر بشیر ملے۔ انھوں نے ایک پل سوچا۔ بتلایا۔ "یہاں اِس نام کی کوئی سینیر ڈاکٹر نہیں کوئی ہاؤس سرجن ہو سکتی ہے۔ ایم، او، فلیٹ میں کئی ہاؤس سرجن رہتی ہیں۔ مگر ابھی کوئی نہ ملے گی۔ ابھی ڈیوٹی آور ہے۔ وارڈ میں کون کدھر ہے۔ پتہ لگانا مشکل کام ہے، ایک، دو بجے لنچ کے وقفہ

یہاں جائیے، شاید ملاقات ہو جائے۔"

میں نے شمس سے کہا۔

"چلیے۔ پھر آئیں گے۔"

"لیڈیز وارڈ ادھر ہے۔ آپ پوچھتے ہیں۔"

اسپرٹ کی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عطر بیز رومال میں نے ناک پر رکھ لیا تھا۔ سرخ سپید رخساروں والی ایک طالبہ کتابیں تھامے ایستھیتھواسکوپ لگائے گزر گئی۔ گھنگرالے بالوں والی ایک سیاہ فام لڑکی تھرکتی ہوئی سامنے وارڈ سے نکل کر دوسرے وارڈ میں داخل ہو گئی۔ ایک معمر نرس عقب سے آئی۔ آگے بڑھی۔

شمس نے روکا۔ کہا۔

"ہمیں ڈاکٹر مایا مرادنہ سے ملنا ہے۔"

"چلڈرین وارڈ جائیے۔"

"چلڈرین وارڈ کدھر ہے؟"

"سامنے داہنے سے جائیے۔"

چلڈرین وارڈ میں کسی نے بتلایا۔

مایا ابھی یہیں تھیں۔ شاید ڈاکٹر گوپال شرن کے ساتھ گئی ہیں۔ ادھر دیکھیے۔ سامنے جائیے۔

میں نے شمس سے کہا۔

"مرحلہ طے ہوا۔"

ڈاکٹر گوپال شرن کے چیمبر میں پردہ گرا تھا۔ اندر ایک مرد، ایک عورت باتیں کر رہے تھے۔

باہر نکلے۔ باتیں کرتے رہے۔ مرد ادھیڑ عُمر کا تھا۔ نیلے سُوٹ میں ملبوس عورت سفید ساڑی میں سفید گلاب کی طرح لگ رہی تھی۔

مرد نے کہا۔

"او۔ کے۔ چلتا ہوں"

عورت مُسکرائی۔ ہماری طرف مڑگئی۔

شمس نے استفسار کیا۔

"آپ ڈاکٹر مایا صراف ہیں؟"

"یس!"

آپ کے یہاں کوئی گیسٹ آئی ہیں۔؟ رادھا!" میں نے پوچھا۔

"ہاں.... وہ! وہ میری بہن ہے۔ اور آپ..... اوہ!— سمجھی!" وہ بولے سے ہونٹ بھینچ کر مُسکرائی۔

میں نے شمس کا تعارف کرایا۔

"جرنلسٹ ہیں۔ یہیں آپ کے شہر میں ایک اردو ویکلی ایڈٹ کرتے ہیں۔ اینڈ ہی از مائی موسٹ انٹی میٹ فرینڈ"

"ویل"

"رادھا کا خط پرسوں شام کو لیٹ آورس میں ملا۔ کل بری آکوپائڈ تھا۔ رات میں ٹرین ملی۔ بہت لیٹ تھی۔ صُبح آیا ہوں۔ دو گھنٹے لیٹ۔

رادھا کہاں ہے؟ کیسی ہے وہ؟"

"آپ اُس سے ملے نہیں؟"

"کیسے ملتا۔ ایک گھنٹے سے تو آپ کا فلیٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ کا پتہ پوچھتا پھر رہا ہوں۔"

کیسے لوگ ہیں یہاں! کسی کو کسی سے مطلب ہی نہیں۔ عجیب سسٹم ہے!"

ڈاکٹر بابا نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"ایک بات ہے۔ آپ کا فلیٹ ڈھونڈنا جتنا دشوار ہے اتنا آپ کو ڈھونڈنا نہیں۔" میں نے دبے لفظوں میں ذرا مسکرا کر کہا۔

"ہاؤ نائیس! اے گڈ کمپلی منٹ!" وہ کھِل پڑی۔

"آیئے چلیں۔"

میں سوچ رہا تھا ــــ کتنی ایلی گینٹ پرسنالیٹی ہے! اِسے تو ماڈل ہونا چاہیئے تھا! ایکٹرس ــــ بس چارمنگ!

ہم سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل سے چوتھی منزل پر آئے۔ ایک کوریڈور سے گذرے۔

"آیئے نا، اِدھر آیئے۔"

سامنے ایک بند کمرہ تھا۔ نیم پلیٹ لگا تھا۔

ڈاکٹر مِس ایم، صراف

ایم، بی، بی ایس، ڈبیٹ)

مایا نے دروازہ کھٹکھٹایا ــــ آواز دی۔

"رادھا۔ رادھا!"

دروازہ کھلا۔ سامنے رادھا کھڑی تھی۔ ہولے سے مسکرا دی

★

دوپہر ــ

رادھا کے ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی تھی جیسے کرشن کو دیکھ کر ہوا کرتی ہے!

وہ ہلکے سبز رنگ کی ساڑی پہنے ہوئی تھی جس پر سفید ریشم سے بڑے بڑے خوشنما پھول کڑھے ہوئے تھے۔ بلاؤز کا میچ بھی وہی تھا۔

میں نے کہا ــ

"آپ اچھی ہیں نا؟ میں تو پریشان ہو گیا تھا ــ اچھا! ان سے ملو۔ میرے دوست ہیں۔ ان کا تذکرہ کیا کرتا تھا تم سے۔ یاد ہے؟"

رادھا نے سر ہلا دیا۔

مایا نے اندر سے آواز دی۔

"اندر آجائیے۔ بیٹھیے!"

رادھا نے کہا۔

"آیئے، آیئے نا!"

شمس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"اچھا! تو میں چلوں؟ آپ باتیں کیجیے!"

"نہیں! آپ بھی آیئے!" میں نے شمس کا بازو تھام لیا۔

اندر جگہ کی تنگی تھی — ایک بیڈ، شفاف چادر، چھوٹے بڑے صاف خوبصورت کئی تکیے۔ نرم گداز لحاف، ایک کرسی۔ ایک میز۔ میز پہ ہز ماسٹرس وائس ریڈیو۔ لکھنے کا پیڈ۔ پین اسٹینڈ۔ دیوار پہ دلکش پینٹنگ والا سالِ رواں کا کلینڈر۔ بغل میں ایک اور دروازہ تھا۔

مایا اُدھر سے نکلی۔ رادھا اندر چلی گئی۔

مایا نے پوچھا —

"آپ میرا اور رادھا کا رشتہ جانتے ہیں؟"

"میں نے کہا —

"نہیں!"

"میں اُس کی ماموں زاد بہن ہوں۔ اُس سے صرف پانچ سال بڑی ہوں۔"

"تو آپ میری بھی دیدی ہوئیں!"

وہ ہنسی۔ اُس کے ہموار چھوٹے چھوٹے دانت جگمگائے۔

"وہ کیسے!؟ ...... آپ کی اور رادھا کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر میں آپ کی ....!!"

پھر بھی میں آپ کو دیدی ہی کہوں گا۔"

بائی دے دی آپ لوگ کیا کھائیں گے — چاول یا روٹی؟"

"ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ آپ زحمت نہ کیجئے۔"

"نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"سچ مانئے۔ ضد کرتی ہیں تو بس چائے پلوا دیجئے۔"

ایک لمحہ رُک کر، میں نے پوچھا۔

"دیدی! رادھا یہاں کیسے آئی ہے؟ کیوں آئی ہے؟"

"آئی ہے میرے ۔۔ بے رنیٹس کے ساتھ۔ جسٹ فار اے چینج۔ رادھا! اِدھر آؤ، بیٹھو۔ آؤ بھی، لگتا ہے شادی مجھے اپنی ہی کرنی ہے! چلو، جاؤ۔۔۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

رادھا آئی اور بیٹھ گئی۔ شرمائی شرمائی سی۔

"تم کب آئیں یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"چار کو۔"

اور آج سترہ ہے! پہلے کیوں نہیں لکھا؟ لکھا بھی تو اتنا مختصر۔ گھبرا دیا مجھے دو رات سے سویا نہیں ہوں۔۔۔ پاگل ہو تم!"

رادھا نے پلکیں جھکا دی تھیں۔

چائے کے بعد رادھا بالکونی میں چلی گئی۔

پردہ ہٹا کر رادھا نے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔

"اپنے دوست کو جانے دیجئے۔ آپ ٹھہریئے۔ باتیں کریں گے۔"

میں شمس کو نیچے سڑک تک چھوڑ آیا۔

واپس ہوا تو دیکھا مایا اور رادھا لنچ لے رہی ہیں۔

"آپ سچ مچ کھا چکے ہیں؟" مایا نے پوچھا

"بالکل سچ مچ۔"

"نہیں کھایا ہوگا تو خود ہی بھوکے رہیں گے۔۔۔ آیئے بیٹھئے۔

میں نے پہلی بار محسوس کیا مایا کی آنکھوں میں بے پناہ کشش ہے اُس کی آواز سن کر نقرئی گھنٹیوں کی صدا یاد آتی ہے۔

"آپ کو بلانے کے لئے رادھا سے میں نے ہی کہا تھا ۔۔۔ سچی محبت کرنے والے مجھے پسند ہیں۔ اُنہیں ایک دوسرے کو پالینا چاہیئے۔ ہر عورت کمزور ہوتی ہے۔ آخری فیصلہ مرد ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ ویسے میں نے رادھا سے کہہ بھی دیا ہے۔ اُسے اپنا عقیدہ بدلنا ہوگا ۔۔۔" ششی ہینر ٹو گو یورٹ

"یہ آپ کا اپنا خیال ہے۔ رادھا سے پوچھئے ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا۔ اِس بات کو میں مانتا بھی نہیں۔"

"آپ جو بھی کہہ لیں لیکن یہ سچ ہے کہ عورت کو مرد کے سایہ میں ہی رہنا چاہیئے۔"

"آپ ایسا سوچتی ہیں؟"

"بے شک!"

رادھا اُٹھ کر بغل کے کمرے میں چلی گئی میں نے مایا کی آنکھوں میں جھانکا ۔۔۔ ایک لہراتی ہوئی موج سی تھی وہاں ایک نیرہ گوں جگمگاہٹ!

رادھا اور مایا کی صورتوں میں ہلکی شباہت تھی۔ پھر بھی رادھا کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ کھیلتی تھی، مایا کی آنکھیں گہری سنجیدہ تھیں۔

آپ جانتے ہیں رادھا کتنے بڑے گھر کی لڑکی ہے لیکن وہ اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔"

"میری راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ وہ لہو لہان ہو جائے گی۔"

"اُس کے شب و روز کے کرب سے مجھے چین نہ ملے گا۔"

آپ کے مسائل سے میں واقف ہوں۔ آپ فیصلہ کیجئے، حل کی صورتیں نکل آئیں گی۔ انسان اپنی سوچ سے زندہ ہے یا مردہ!"

"آئی ایم کن فیوزڈ۔" مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔"

"آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ رادھا کو اپنا لیجئے یا اُس کی زندگی سے نکل جایئے۔"

"میرے لئے دونوں ہی مشکل ہیں۔"

"آپ خدا میں یقین رکھتے ہیں؟"

"نہیں!"

"آپ کی بے یقینی ہی آپ کو اپنی کمزوری کا احساس دلاتی ہے۔ یہی آپ کے سارے دُکھوں کی جڑ ہے۔"

مایا کی تیوریوں پر بل پڑنے لگے تھے۔ اُس کے چہرے پر تناؤ تھا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی۔

"رادھا کا کیا ہوگا؟"

میں چند ثانئے خاموش رہا۔

"اُسے ایک نئی زندگی شروع کرنی چاہیئے۔"

حالانکہ اِس بات کی صداقت پر مجھے خود ہی شبہ تھا۔

"کسی دوسرے کو وہ کیا دے پائے گی جب تک جئے گی، جلے گی۔ فریب دے گی، خود کو اپنے شریک حیات کو۔ آپ بھی کسی اور سے شادی

کرکے اُسے وہ پیار نہ دے پائیں گے! کتنی زندگیاں تباہ ہوں گی!"

"رادھا جاتی ہے میری زندگی میں وہ نہ آتی تو کوئی دوسرا بھی نہ آئے گا۔ میں تنہا رہوں گا۔"

آپ مرد ہیں ایسا کہہ سکتے ہیں۔ عورت ایسا سوچ بھی نہیں سکتی! زیادہ سے زیادہ ایک دو ماہ کے اندر اس کی شادی ہو جائے گی۔ پھوپھا آئے تھے۔ کہہ رہے تھے:"

"مجھے خوشی ہوگی!"

"آپ بزدل ہیں! آپ نے اُس کی زندگی تباہ کردی۔ جن دقتوں پریشانیوں سے آج بھاگ رہے ہیں، پہلے بھی سوچ سکتے تھے۔ تباہ نہیں کرنی تھی تو اُس کے قریب بھی نہ آتے! جب آپ کو دماغ سے کام لینا چاہیئے تھا۔ آپ دل سے کام لیتے رہے، اب جبکہ تقاضہ ہے کہ دل سے کام لیں تو دماغ کو بیچ میں لا رہے ہیں۔ جائیے! آئندہ کسی لڑکی کو بھلاوا نہ دیجئے گا!"

"آپ مجھے نہیں جانتیں ۔۔۔! اُس سے پوچھئے۔ میں نے ہمیشہ اُسے ڈِس کرج کیا ہے۔۔ اُسے کوئی خواب نہیں دکھلایا۔ پھر بھی میں شرمندہ ہوں! مجھے معاف کیجئے!!"

"ہاں! ہاں!! قصور اُسی کا ہے۔ مرد کو کوئی کچھ نہ کہے گا! عورت ہی فلرٹ ہوتی ہے! آپ کا کیا ہوا؟ کچھ نہیں! اُس کے نقصان کی تلافی ہو پائے گی ۔۔؟ نہیں!! اُس کا تو Physical loss ہوا ہے! جائیے یہاں پھر نہ آئیے گا۔ آپ غیر ہیں آپ کو اور کیا کہوں! یہ تو میری خون ہے! اسے ہی ڈانٹوں گی۔

اپنی روش بدلے۔"

رادھا گم صم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ مایا گلاس سے پانی پی رہی تھی۔ میں بھاری قدموں سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔

★

شام —

قیام گاہ پر دوبارہ شمس کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ مقررہ وقت سے تقریباً نصف گھنٹہ لیٹ آئے۔

آتے ہی پوچھا۔

"کیا ہوا؟ کیا باتیں ہوئیں؟ — آنکھیں سُرخ کیوں ہیں؟ چہرہ بھی زرد ہے!"

میں نے ساری داستان سُنائی۔

مزید کہا —

"آخر میں تلخی انتہائی درجہ بڑھ گئی۔"

شمس نے کہا —

"آپ کی باتیں مایا کو مجروح کر گئیں۔"

"جو کچھ محسوس کیا کہہ دیا۔ جو دُسوسے تھے۔ ظاہر کر دیئے۔ میں کیا کرتا!"

"رادھا بہت معصوم ہے۔ آج کا غم یہ سہہ سکے گی؟ مایا ٹھیک کہتی ہے آپ نے اُسے دھوکا دیا ہے اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ کے سامنے

اندیشے فضول ہیں!"

"آپ جانتے ہیں میرا (Settlement) نہیں ہوا ــــ کل کیا ہو؟ کس کو پتہ! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو رادھا کس کے سہارے رہے گی۔ اپنے گھر اُسے رکھ نہیں سکتا۔ اُس کی آخری پناہ گاہ اُس کا اپنا گھر ــــ میں کیسے چھین لوں!؟"

"کل کیا ہو گا! نہ سوچئے۔ سوچئے گا۔ تو قدم رک جائیں گے ــــ منزل گم ہو جائے گی۔"

"میری تو کوئی منزل نہیں! اپنے آپ میں محبوس ہو کر رہ گیا ہوں!"

"چلئے ــــ چند قدم ٹہل آئیں۔"

الفنسٹن پکچر ہاؤس، کوالیٹی، کیٹ کیٹ، گاندھی میدان، اکزی بی شن روڈ، فریزر روڈ، ہم پیچھے چھوڑ آئے ــــ منگولیا بار سے نکلے۔ رگوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔ سر میں جھنجھناہٹ سی تھی۔ قدم اِدھر اُدھر پڑ رہے تھے ــــ بائیں طرف سامنے اے، آئی، آر کی عمارت تھی

میں نے شمس کی ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں تھام کر دبایا ــــ جذبات بھرے لہجے میں کہا ــــ

"دوست! مایا کا حکم رادھا کا فیصلہ نہیں! دیکھ لینا میری طرح وہ بھی تنہا رہے گی ــــ اِسی لئے تو مایا کی پناہ میں آئی ہے۔"

شمس نے تعجب بھری نگاہ میری طرف ڈالی۔

"اگر اس کے والدین نے زور زبردستی کی تو؟"

"تب وہ ایک ساتھ دس بارہ سلیپنگ پلس لے لیگی۔ یا پوٹاشیم سائنائڈ کھا لے گی!"

"اُس موت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی!"

"نہیں دوست! مجھ پر نہیں۔ اُس کے گھر والوں پر!! وہ تو دو سال پہلے مر گئی ہوتی ـــ!! جس بڑے گھر سے اُس کا تعلق ہے وہاں دولت کی فراوانی تو ہے لیکن پیار کا ایک قطرہ نہیں! شفقت کی ایک بوند نہیں!! صرف خودغرضی کا سمندر لہریں مار رہا ہے! کوئی اُسے چاہ سکے، اُسے سمجھ سکے۔ اُس کے لئے وہ ترستی تھی۔ تڑپتی تھی۔ میں نے اُسے والہانہ پیار کیا ـــ میرے گرد اُس نے ایک خواب بن لیا ـــ میں پیچھے ہٹنا رہا۔ وہ قریب آتی گئی ـــ

"سگریٹ!"

"تھینکس!"

سامنے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار کار کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں ـــ

شمس نے آواز دی ـــ

"ٹیکسی ـــ ٹیکسی!"

★ ★

ہم نشیں

میرے بازوؤں کے حلقے میں وہ پھڑک رہی تھی۔

کبھی کبھی جب قدم ڈگمگاتے تو اُس کے رُخسار میرے چہرے کے بہت نزدیک ہوتے۔ کئی طرح کی ملی جلی خوشبوئیں میری ناک میں سمانے لگتیں۔ میری گرفت کچھ اور مضبوط ہو جاتی۔ ذرا سی لغزش کا احساس ہوتا اور میں سونیا کو کسی قریبی نیم تاریک گوشے میں کھینچ لے جاتا۔ آرکیسٹرا کی دُھن گونجتی رہتی۔ ہمارے جذبات سُلگتے رہتے۔ سونیا میری باہوں میں اُن دنوں بھی رہی ہے جب اُس کے عارض اتنے تابناک نہ تھے، ہونٹوں میں اتنا گداز بھی نہ تھا، نہ بازو ہی ایسے بھرے بھرے اور سڈول تھے آج تو وہ سراپا قیامت ہے! شیمپین کے کئی جام پی کر بھی اتنا سُرور نہیں آتا۔ جتنا نشہ اُس کی ایک ہلکی مسکراہٹ میں ہے جب وہ ہنستی ہے تو گالوں میں ہلکے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ یونہی ہنستی رہے اور یہ گڑھے...... عجیب کشش ہے ان میں! میرے لبوں سے سگریٹ چھین کر اکثر ایک آدھ کش لگاتی ہے۔ پھر کچھ ایسے انداز میں ہونٹ سکوڑتی ہے کہ میں خود کو سنبھال نہیں پاتا۔ عورت کے حسن کا مرکز یہ ہونٹ ہی تو ہوتے ہیں۔ کبھی دلربائی کے ساتھ احتجاج کرتی ہے۔

"نو! دِس از ویری اِن ڈِی سینٹ!"

میں مان بھی جاؤں تو دل نہیں مانتا۔ اُسے آتی جاتی نگاہوں کی پروا ہوتی ہے نہ دبے دبے قہقہوں کی۔ حجاب سے گھٹن پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے لئے زہر ہے۔ چند لمحوں کی چھوٹی سی یہ زندگی! کوئی کتنے لبادے اوڑھے کیسے کیسے نقاب چڑھائے!

اُس کیف آگیں شام کو ہوٹل نٹ راج میں بال رُوم کے لئے وہ میری ہم رقص تھی۔ ابھی ابھی ہم نے شراب کے کئی جام چڑھائے تھے۔ اُس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ میری رگوں میں چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ موسیقی کی لہروں کے ساتھ ساتھ ناچنے والے جوڑوں کے قدم نپے تلے انداز میں گھوم رہے تھے۔ گرم بخشیں میں رومان کی فراوانی تھی۔ اُس کی ہتھیلیوں میں بلا کا گداز تھا۔ اور حرارت! شاید اُس پر نشے کا کچھ زیادہ اثر ہو رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتی۔ میں سنبھال لیتا۔

"او، نو! وہ ہونٹ سکوڑتی۔ پھر مسکرا دیتی"۔

"تمہاری مسکراہٹ کے بغیر سُرور ہی نہیں آتا!"

"فراڈ!"

"بالکل سچ!"

"کبھی کبھی تم ایسی بات کہہ دیتے ہو۔۔۔" سونیا نے ماتھے پر آتی ہوئی ایک لٹ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"تم ہی بتاؤ کس مشکل سے مل پائی ہو۔ ایسا بھی کیا غیروں کے درمیان اپنوں

کو فراموش کر دیا جائے۔ میں نے شکوہ کیا۔

"مجھے یاد کرتے ہو؟"

"ہاں ہر لمحہ، ہر گھڑی!"

"جھوٹے!"

"بائی گاڈ!"

"سونی!"

"ہوں!"

سنہا صاحب کے مزاج کیسے ہیں! آج کل ملاقات ہی نہیں ہوتی!"

"اوہ! پتی دیو! زیادہ مشغول ہیں۔ بزنس والوں کو فرصت کہاں رہتی ہے"

"مجھے تو رہتی ہے"

"وی کِڈ مین! لڑکیوں کے لئے نا!"

وہ ہنسنے لگی، خوشبو کی لپٹیں اُٹھیں۔ میں نے اُسے اور قریب کھینچا۔

آرکسٹرا تھم گیا۔ رقص کا پہلا راؤنڈ ختم ہو چکا تھا۔

ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہم ایک خالی میز کی جانب بڑھے۔

"ہلو سونیا! کیسی ہو؟"

"سونی ڈارلنگ!"

"ونڈرفل! ہاؤ ایکسیلینٹ یو لُک!"

"سونیا بلیسز۔ ایک نظر ادھر بھی!"

"مائی سویٹ....."

اس کے شناسائی اُسے گھیرتے رہے۔ کوئی اُس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بانہیں تھام رہا تھا۔ کسی نے اُسے گلے لگایا۔ کسی اور نے گال تھپتھپایا وہ ہولے ہولے مسکراتی رہی۔ سونیا کے اتنے سارے دوست ہیں۔ اُس کے ساتھ کہیں چلے جایئے۔ شہر کے کسی گوشے میں، کسی محفل میں ہر جگہ اُس کے دوست موجود ہیں۔ سونیا کو اپنے دوستوں پر ناز ہے۔ اُس کے دوست اُس پر فریفتہ رہتے ہیں۔ اُس نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا اور دوستی کی بنیادیں خوش سلیقگی ہی پر تو استوار ہوتی ہیں!

ہال کے جنوبی گوشے میں بھیڑ کم تھی۔ ہم وہیں چلے آئے۔ میں نے شراب کا آرڈر دے دیا۔ سونیا میک اپ دُرست کرنے لگی۔ لپ اسٹک کی تہہ بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ گالوں کی سُرخی بھی مدھم ہو چلی تھی۔ پرس کے چھوٹے سے آئینے میں دیکھ دیکھ کر وہ اپنی نوک پلک سنوار رہی تھی۔ میں نے جام میں شراب ڈالی۔ پھر سوڈا ملانے لگا۔

"تمہارے لئے بھی؟" میں نے سونیا سے پوچھا۔

"بس تھوڑی سی"، جواب ملا۔

عجیب عورت ہے ابھی بہک رہی تھی۔ لڑکھڑا رہی تھی۔ لیکن پینے سے باز نہ آئے گی۔ میں سوچنے لگا۔ پھر عجیب سی گدگدی کا احساس ہوا۔ کتنی گزری ہوئی راتوں کے مست و مدہوش کُن سائے نگاہوں میں جھوم اُٹھے ہاں وہ دائیں طرف گردن سے بہت نیچے، جہاں سُرخ سپید گوشت کی دلفریب تہیں ہیں۔ وہیں ایک بڑا سا تِل ہے اُسی طرف برف سی اُجلی شفاف

بِلڈرنگ سے اُوپر ایک اور کالا دھبہ ہے اُف اُس کے نیول کی گہرائی!
توبہ توبہ! اُس کی پنڈلیوں پر بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے بہت
سے بال ہیں۔ اور اُس کے جِسم کی حِدت! مُجھے محسوس ہوا میرے پورے
بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہوں۔

"اِس سال بھی شادی نہیں کی۔ تنہائی میں نیند کیسے آتی ہے تمہیں؟"
سونیا نے میری سوچ کو منتشر کر دیا۔

"راتیں کٹ ہی جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی طرح۔" میں ایک لمحہ کے
لئے رُکا۔

"آج میرے یہاں رہ جاؤ......" میں نے اپنی غرض اُس کے سامنے رکھ
دی۔ اُس نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ پل بھر کو چُپ رہی۔ پھر بولی۔

"آج نہیں، کبھی اور سہی۔"

میں کچھ نہ بولا سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنانے لگا۔

"بُرا مان گئے؟" سونیا نے میرے ہونٹوں سے سگریٹ چھین کر اپنے ہونٹوں
میں داب لیا۔

"زبردستی تو ہے نہیں۔ تمہاری مرضی۔" میں نے دوسرا سگریٹ جلاتے
ہوئے کہا۔

"دراصل آج کے لئے کمِٹ (commit) کر چکی ہوں۔ اور تم جانتے
ہو دوستوں کو میں ناراض نہیں کر سکتی۔"

"خیر! کسی کو کال (call) کر لوں گا۔ جذبات کو کچلنے کا میں عادی نہیں۔"

"ڈیل!" حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

کیا تم آوارہ عورتوں سے بھی ملتے ہو؟"

میں خاموش رہا۔ سگریٹ کا ایک ہلکا کش کھینچ کر دھواں اُس کے چہرے پر چھوڑ دیا۔

"نائی بوائے! تمہارا ٹیسٹ (Taste) اتنا خراب کیوں ہو گیا ہے؟"

میں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔

آرکسٹرا پھر شروع ہو گیا تھا۔ رقص کے دوسرے دور کے لئے جوڑے فلور پر آنے لگے تھے۔ میں نے سونیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکھڑاتی ہوئی وہ اُٹھی اور میری باہوں میں آ گئی!!

★ ★

اَب جو آئے ہو

ہم تیسری بار گلی سے نکل کر سڑک پر آئے تھے۔

اُدھر سمٹتی ہوئی تاریکی تھی، اِدھر نکھرتے اُجالے۔ آگے پیچھے تمام شاہراہیں سنسان پڑی تھیں۔ لیمپ پوسٹ کی اونگھتی ہوئی مدھم روشنی مضمحل اور اداس لگ رہی تھی۔ سامنے کھڑی بڑی سی پُرشکوہ اسکول کی عمارت جو سارا دن جاگ کر گذارتی تھی۔ اِس وقت پُراسرار طور پر محوِ خواب تھی۔ اُس طرف خانقاہ کے احاطے میں پُرہول سناٹا تھا۔ مزار کے روشن دانوں سے چھَن چھَن کر ٹیوب لائٹس کی شعاعیں آرہی تھیں۔ مرادیں مانگنے والے کب کے جاچکے تھے۔ کنویں کے قریب دیوہیکل نیم کا درخت بھی دم سادھے کھڑا تھا۔ اُس طرف ذرا پرے شیو کے مندر کی گھنٹیاں بھی کب کی خاموش ہو چکی تھیں۔ یکایک اگلے موڑ سے جاتے ہوئے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کتے بھونکنے لگے۔ گشت کرنے والا سپاہی ہوگا۔

میں نے ٹھٹھک کر سوچا۔ آگے بڑھیں یا پیچھے مڑ چلیں۔

کامنا نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"کہاں کھو گئے؟ چلئے نا! کوئی آگیا تو؟"

جس وقت ہم پہلی بار گلی میں داخل ہوئے، ٹاور کے گھنٹوں کی آواز

سناٹے میں گونج رہی تھی۔ میں نے ٹارچ جلا کر کلائی کی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ دسمبر کی بیس تاریخ تھی۔ میں نے موسم کے موافق اونی کپڑے پہن رکھے تھے۔ لیکن ٹھہر ٹھہر کر مجھے لرزہ کا احساس ہوتا اور پورے بدن میں ایک سردی لہر دوڑ جاتی۔ اس نے آنچل سے سر چھپا لیا تھا۔ کارڈیگن پہنے ہوئی تھی۔

رُک رُک کر وہ کھانس رہی تھی۔ اُس کی ہتھیلی ہتھیہ کی طرح بھیگ رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس طرح شبنم میں بھیگ کر وہ یقیناً بیمار پڑ جائے گی۔

مہندی کی باڑھوں والے جس مکان کے پیچھے ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب ہم کھڑے تھے؛ وہاں سے کامنا کے مکان کی چھت صاف نظر آتی تھی۔ وہاں کھڑکیاں بند تھیں؛ تاریکی چھائی تھی۔ فضا پر کہر کی ہلکی سی پرت جمی ہوئی تھی۔ آسمان پر تاروں کی ہلکی ہلکی جھلملاہٹ تھی۔ لکڑی کے پُل سے گذر کر نالہ پار کرتے ہوئے میں نے کامنا سے کہہ دیا تھا۔ اُس منہدم دیوار کے پاس سے لوٹ آؤں گا۔ آگے اُس کی منزل، پیچھے میرا راستہ! اُس نے میرے شانے پر اپنا سر ہولے سے ٹکا کر کہا تھا۔

"میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ مجھے لے چلئے، کہیں دُور!"

اُس کی پشت پر میں نے نرم نرم تھپکیاں دی تھیں۔

"بے بی! پاگل نہ بنو!"

کامنا کی آنکھیں میرے چہرے پر ٹھہرے ہوئی تھیں۔ کپکپاتی سردی کے باوجود اُس کے جسم میں عجیب سی حدّت تھی۔ میں نے اُس کے بالوں کی

ایک چوٹی اُس کی گردن میں لپیٹ دی۔ وہ مُسکرادی۔ پھر میری جانب جُھکی۔ حزن بھری ایک سرگوشی میں بولی۔

اپنے ہی ہاتھوں میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے؟ میں جینا نہیں چاہتی.....! اُس گھٹن سے مجھے نکال لیجئے۔ یا پھر زہر کے دو گھونٹ پلا دیجئے......میں جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنا کیوں نہیں لیتے؟"

کامنا کی سسکیاں سنسناتی ہوئی میرے کلیجے میں اُتر رہی تھیں۔ اُس نے اپنی کسی کسی باہیں میری گردن میں ڈال دی تھیں۔ اپنے آپ میں میں ایک انتشار سا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کہیں کچھ ٹوٹ رہا ہو۔ بکھر رہا ہو۔ سامنے درخت پر کوئی پرندہ اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ بغل کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے کود کر ایک سیاہ بلی پاس کے مکان میں جا گھسی۔

کامنا کی سانسیں میری سانسوں میں اُلجھ رہی تھیں۔

گلی سے نکل کر سڑک پر آتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کامنا کے قدم ہموار تھے۔ آج تو اُس کے قدموں کی آہٹ سے پازیب کی جھنکار بھی نہیں پھوٹ رہی تھی۔ اُس کی کلائیوں میں چوڑیاں بھی نہیں کھنک رہی تھیں کنویں کے پاس نیم کے درخت کے نیچے میں نے اُس کے کانوں میں جھولتے آویزوں کو اپنے دِل کی دھڑکنوں کی طرح ہی کبھی اُبھرتے، کبھی ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔

خانقاہ کے عقب میں ہارسنگھار کی سونی ڈالیوں کے قریب کامنا کو اپنے پہلو میں کھسکاتے ہوئے اُس کے کپڑوں میں جو سرسراہٹ ہوئی تو میں نے

محسوس کیا جیسے میری رگوں میں خون کی رفتار بھی تیز ہو گئی ہو! اُس کی گردن کے کھلے حصّے بھی ایسے لَو دے رہے تھے جیسے کہ میرے بھیگے ہوئے ہونٹوں کی نمی بھی پل بھر میں بھاپ بن کر اُڑ جائے گی! اُس کے بالوں سے چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو نکل رہی تھی۔

میں نے اُس کے کانوں کی سُلگتی لَویں اپنے کانپتے لبوں سے چھُو لیں۔ چھوئی موئی سی وہ میری باہوں میں سمٹ آئی۔

"مجھے تھامئے..... اپنے آپ میں سمیٹ لیجئے۔ یوں ادھوری کیسے رہوں اِس کسک کا کیا کروں؟ جی ڈرتا ہے کوئی ہمیں جُدا نہ کر دے..... میں ہی چھِن جاؤں، آپ ہی دُور ہو جائیں....."

"شش"

آسمان کی پہنائیوں میں ایک ستارہ ٹوٹ کر گرا۔ دُور تک ایک روشن لکیر سی پھیلتی چلی گئی۔ نالہ کے قریب کی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی۔ کہیں پاس ہی سے گیدڑوں کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔

میرے اندر بھی ایک ہلچل سی مچی تھی۔ میری گرفت کبھی کس جاتی۔ کبھی ڈھیلی پڑ جاتی۔ کنپٹیاں کبھی دہک اُٹھتیں، حلق میں کانٹے سے چبھ جاتے کبھی ہونٹ رس میں ڈوب جاتے۔ کامنا میری باہوں میں جھول جاتی۔ کبھی میرے شانے پر سر ٹِکا دیتی۔ آنکھیں بند کر لیتی۔ میں اُسے تھپکیاں دیتا ایسے ہی جیسے کوئی ماں اپنے بچّے کو لوریاں سُناتے ہولے ہولے تھپکنے لگتی ہے۔

"کتنا سکون ہے یہاں! جی چاہتا ہے انہی باہوں میں سو جاؤں۔

مجھے اپنے میں چھپا لیجئے۔ آپ سے دُور ہوئی تو مر جاؤں گی..... کیا جیوں، کس کے لئے جیوں؟! میرے قریب آپ ہی نہیں تو میری سانسوں کا یہ بھرم بھی کیا! اپنی پناہوں میں مجھے آنے دیجئے...... میری مانگ میں سیندور بھر دیجئے"

میں نے اُس کی تھوڑی آہستہ آہستہ اُٹھائی۔ اُس کی ناک کی سنہری کیل روشنی کی کوئی کرن پا کر جگ مگا گئی۔ اُس کی شفاف پیشانی کے پس منظر میں بڑی سی سُرخ بندیا ایسی ہی لگی جیسے جھل جھل کرتے دریا کی موجوں سے اُبھرتا سورج! کامنا کے ہونٹ تھرتھرا کے رہ گئے۔

میں نے اُس کے سر کا آنچل ذرا آگے پیشانی پر کھینچ دی۔ وہ شرما گئی۔ پلکیں جھک گئیں۔ دن کے اُجالے ہوتے تو میں شمار کرتا اُس کے چہرے سے ٹکرا کر کتنے رنگوں کی لہریں گذریں! اُس کی آنکھوں میں اُمڈتی گھٹاؤں کی پرچھائیں بھی نظر آ جاتی! اُس کے ہونٹوں پر کھُلتی شفق بھی جھلک جاتی!

میں نے اُس کی ہتھیلیاں تھام لیں، دبا دیں۔ وہاں اپنے تپتے ہونٹوں کی مہر بھی لگا دی۔ کامنا نے اپنے ملائم رُخسار میرے کھُردرے بالوں پر رکھ دیئے۔ اپنی گردن پر اُس کی سانسوں کی تمازت میں نے محسوس کی۔

"میرے لئے ایسے کیوں تڑپتے ہیں؟ آپ کی بانہوں میں ہوں، میری نس نس میں شرارے بھر دیجئے۔ میرے اندر یہ کیسی جلن سی ہے، اک آگ سی لگی ہے! یہ تپش، یہ لَو اور بڑھا دیجئے!"

کامنا نے اپنی سبک سبک انگلیاں میرے خشک بالوں میں پھنسا دیں۔ کھیلتی رہی۔ دھیرے دھیرے میری پیشانی سہلانے لگی۔ اپنے گالوں پر بھی

اُس کے نرم ہاتھوں کا لمس میں نے محسوس کیا ـــــ یکایک اُس کے لہجے میں ہلکی خفگی اُبھر آئی۔

آج شیو بھی نہیں کیا ؟...... سنیاس لیں گے ؟ مونچھیں کیوں بڑھالی ہیں ؟ کیسے ڈراتا ہے ؟ مجھے .... ؟"

"جوگی مہاراج ! یوں تھک ہار کر نہ بیٹھئے ۔ کیوں بھولتے ہیں ۔ آپ کی زندگی کے ساتھ اب میں بھی وابستہ ہوں ۔ میں سے آپ کو تپی بانٹ آئی ہوں ..... پھر اِدھر میں تڑپوں ، اُدھر آپ ترسیں ! .... کیوں ؟"

اُس کی آواز کے سحر میں میں کھو گیا ۔

"آپ کی آنکھوں کی ویرانی اب دیکھی نہیں جاتی ۔ اپنی زندگی کی ساری ادائیاں مجھے کیوں نہیں دے دیتے ؟ ..... آپ کو کوئی غم نہ ملے ۔ اس کے لئے ہمیشہ پرارتھنا کرتی ہوں ۔ میری دعا ہی بے اثر ہے ! گنہگار ہوں نہ ...... ؟ آپ کی خوشیاں جو چھین لی ہیں !"

اُس کے اظہار کی تڑپ مجھے بے قرار کر گئی ۔

"دنیا کی نظریں تو یونہی ڈرائیں گی ...... زمانے نے کس کی خوشی دیکھی ہے ؟ وقت گذرا تو دن بھی بدل جائیں گے ـــــ ہم یونہی چلتے رہیں ، زندگی کا سفر کٹ جائے گا ..... "

میری سرد ہتھیلیاں اُس نے اپنے دہکتے رخساروں پر رکھ لیں ۔

"ہر شام آپ کو انہیں راستوں سے گذرتے ہوئے دیکھتی ہوں ۔ آپ کی نگاہوں میں کیسی محرومی ، کتنی یاس ہوتی ہے ! میرے دل پر کیا گذرتی

ہے۔ اپنی حسرتیں کیا بتاؤں؟"

میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔

"رات کروٹیں بدل بدل کر بیت جاتی ہے اپنے نصیب پر آنسو بہاتی ہوں۔ جیسے ٹوٹ کر جا ہا اُسے پا بھی نہیں سکتی۔ لمحہ لمحہ جس کی اُپاسنا کی، اُس کے چرنوں میں پھول بھی نہیں چڑھا سکتی۔ اُس کی آرتی نہیں اُتار سکتی، اُس کے ماتھے پر تلک بھی نہیں لگا سکتی..... "

وہ سسک پڑی۔

نصف چاند کی ننھی ننھی روپہلی روشنی پھیل گئی تھی۔ شیو کے مندر کے رُو برُو میری اور کاماسنا کی پرچھائیاں ساکت لگ رہی تھیں۔ جنگل کی لہریں تیز ہو چکی تھیں۔ میرے اندر کہیں شعلے سے لپک رہے تھے۔ ذہن دھواں دھواں سا تھا۔ پے بہ پے میں نے پانچ سگریٹیں پھونک ڈالی تھیں۔ چھٹی سگریٹ اُس نے میرے ہونٹوں سے چھین کر پھینک دیا تھا۔ میں نے اُس کے گیلے ہونٹوں پر اپنی کھردری اُنگلیاں رکھ دی تھیں۔

★ ★

اُس رات

اپنے لباس کی آخری شکن بھی اُس نے ٹھیک کر لی ـــ بلاؤز کا ہُک لگا لیا بالوں کو جوڑے میں باندھ لیا، آنچل سجا لیا، اور پھر اپنی نیلم کی انگوٹھی اتار کر دوبارہ پہننے لگی۔

ڈرائنگ رُوم اور باتھ رُوم کو ملانے والی تنگ راہداری مرکری لائٹ سے روشن تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی ڈرائنگ روم کے بند دروازوں کے شیشوں سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ کمرے کی فضا پر بظاہر دھندلاہٹ چھائی تھی لیکن دیواروں کے رنگ رُوپ کے پسِ منظر میں مجھے ارجنا کی لچکتی ہوئی شبیہ صاف نظر آرہی تھی۔ اُس نے اب کانوں میں جھمکے پہن لیے اور صوفے پر میرے پاس کھسک کر بیٹھ گئی۔

......جب میں موزے پہن رہا تھا وہ مجھے مدد دینے کے لئے بڑھی تھی۔ دراصل وہ میرے پیر کو چھونا چاہتی تھی۔ اُس کے اِس شوق سے مجھے اکثر بڑی کوفت ہوئی ہے۔ کئی بار ڈانٹا بھی ہے لیکن وہ کہتی ہے، یہ تو عورت کا دھرم ہے!' اب اِس کا کیا جواب! میں خشمگیں ہو کر رہ جاتا ہوں۔

اُوپر شرن کی خوابگاہ سے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹ مسلسل اُبھر رہی

تھی۔ اُس کا مطلب یہ ہوا کہ اُسے نیند نہیں آئی۔ ذہنی انتشار پر قابو پانے کے لئے وہ آہستہ روی سے ٹہل رہا تھا۔ شرن کی یہ پُرانی کمزوری ہے ایسے مواقع پر اُسے بے خوابی ہو جاتی ہے۔ میکے میں بھابھی پانچ پانچ بچوں میں گھری خراٹے بھرتی ہوگی! کئی بار زینے اُتر کر شرن دروازے کے قریب آیا تھا۔ مجھے آواز دی تھی۔ کسی خاص ضرورت کے متعلق دریافت کیا تھا اور ہر بار مجھے مطمئن پاکر واپس لوٹ گیا تھا۔

..لطف شب سے ذرا پہلے تک میں ارچنا کے ساتھ شہر کی خاص شاہراہوں پر گھومتا پھرا تھا۔ اُس وقت تک شہر کی آنکھیں تقریباً بند ہو چکی تھیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہم ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے، اتنی دیدہ دلیری سے چل پھر نہیں رہے ہوتے۔ ارچنا تو تب بھی کھلی جا رہی تھی۔ لیکن میرے لئے یہ سب کسی معرکہ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ منزل کا پتہ نہیں تھا۔ سمتوں کا تعین ہمارے بڑھتے ہوئے قدموں سے ہو رہا تھا۔ ارچنا چاہتی تھی ہم یونہی چلتے رہیں۔ میں کہیں دم بھر ٹھہر جاتا تو وہ آگے بڑھ جاتی۔ پھر ذرا تیز چل کر میں اُس کے دوش بہ دوش ہو پاتا۔

.....چاندکی چمپئی کرنوں سے سجے بام کے جھنڈوں کے قریب رُک کر، شبنم سے بھیگے سبزہ پر دُور دُور تک دوڑتے رہنے کی شدید خواہش ہوئی۔ ایسے میں ہانپتے ہوئے ایک دوسرے کو بھاگ کر پکڑنے میں کیسا لُطف آتا ہے! ارچنا کو میری تجویز پسند نہ آئی۔

کالی مندر کی ٹھنڈی صحن پہ لوٹ لوٹ جانے کی بات بھی اُس نے رد کر دی۔

مندر کی سیڑھیاں اُتر کر تالاب کے کنارے بیٹھنے، پانی میں چھل بل کرتے ہوئے ماہتابی عکس کو دیکھتے رہنے کا خیال بھی اُسے سجھا نہیں۔

میں نے فہیم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی آواز نہ آئی۔

مجید کی رہائش گاہ کے کواڑوں پر دستک دی۔ وہاں بھی مایوسی ہوئی۔

آخر میں ثمرن کی کال بیل بجائی، خشک حلق سے تھوک نگل کر، گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ارچنا کی طرف دیکھا —— وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

..... ثمرن کو کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے اس لئے میں نے پہلے ہی ارچنا کا تعارف کرا دیا —— میری گرل فرینڈ! ثمرن نے کچھ اس طرح مسکرا کر خیر مقدم کیا جیسے کہہ رہا ہو مجھے آپ ہی کا انتظار تو تھا! جنس لطیف ثمرن کی خاص کمزوری ہے۔ اُس کے اطوار میں نفاست بھی، اکثر اُس کے حواس غیر متوازن سے لگتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہمیشہ بے ضرر ہی رہا ہے۔ ارچنا کے رُو برو ہی اُس نے میری پسند کی داد دے دی۔ ارچنا شرما گئی۔ ثمرن نے اُس کی آنکھوں کی تعریف میں ایک شعر بھی موزوں کر دیا۔ ارچنا کے ہونٹوں پر ایک رُکی رُکی ہنسی بکھر گئی۔

..... میں نے ثمرن سے کہہ دیا تھا ہم سوئیں گے نہیں، یونہی باتیں کر کے شب بیداری کریں گے۔ قرب کی یہ گھڑیاں بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ہم انہیں گنوائیں گے نہیں! ثمرن کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی۔ اُس نے اصرار کر کے اپنا گرم شال ارچنا کے کاندھے پر رکھ دیا۔ میرے پیروں پر اپنا گُدراز کمبل ڈال دیا۔ جاتے جاتے ہدایت کی کہ اونچے لہجے میں ہم گفتگو نہ کریں سناٹے میں آواز باہر تک پھیل جاتی ہے سونے کی خواہش ہو تو بتی بجھا دیں۔ گڈ نائٹ!

.....میں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ گرد و پیش پر ڈالی۔ دیوار پر ایک نیم عریاں ماڈل کی پینٹنگ تھی۔ طاق پر ایک جانب گنیش کی مورتی رکھی تھی۔ دوسری طرف لکشمی کی مورتی تھی۔ لکشمی کے گلے میں کمہلائے ہوئے پھولوں کا ہار تھا۔ صوفے کے سامنے ہی قدِ آدم آئینہ تھا۔ آئینے میں اُبھرتے ہوئے عکس میں میں نے دیکھا میرے پہلو میں سمٹی ہوئی ارچنا کا گلنار چہرہ کچھ اور نکھر گیا تھا۔ میز پر ترن کی مسکراتی ہوئی فریم شدہ تصویر ہماری رازداری کی طرح لگی۔

ارچنا کچھ سمٹ کر، کچھ کھل کر بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں یا ممکن ہے میری آنکھوں میں ہی کچھ ایسی کشش عود کر آئی تھی کہ ہم دونوں کی پلکیں جھپک نہیں رہی تھیں! میری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ رُک رُک کر سارے بدن میں سہرن سی ہوئی۔

ارچنا چونک اُٹھی۔

"کیا ہوا؟"

".....کچھ نہیں.....!"

میری آواز میں شدید لرزش تھی۔

ارچنا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باہیں پھیلا کر انگڑائی لی۔ ہونٹ بھینچتے ہوئے مُسکرائی۔ بولی۔

"نیند آنے لگی!"

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"سوئیں؟"

باہیں سمیٹ کر وہ ہنسی پڑی۔

اُس کا آنچل سرک گیا۔ کچھ لہراتے ہوئے بالوں کی لٹیں ماتھے پر جھوم گئیں اُس کی آنکھوں میں نشہ سا تھا، ہونٹوں پر سحر! میری نگاہیں کہاں کہاں بھٹکتیں؟ میں اُس کی گردن کی شکنوں کو دیکھتا یا اُس کے ادھ کھلے شکم کی لہروں کو! اُس کے کولہوں کی قوسیں بھی اُبھر آئی تھیں۔

اُس نے جماہی لی۔ ہونٹ سکوڑے۔ خوابناک آنکھوں میں میری طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سُرخی تیرنے لگی تھی۔ اُس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں بج اٹھیں۔ ارچنا کی ہتھیلیوں پر مہندی سے بنے گُل بوٹے بے حد خوشنما تھے

آنچل سنبھال کر، انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ میری جانب بڑھی۔ میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ میرے گھٹنوں پر اپنی تھوڑی رکھ دی۔ میں نے اُس کی زلفوں سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو محسوس کی۔ اُس کی سونی مانگ پر میری نگاہیں اٹک گئیں۔

اُس کی ہنسلیوں کی ہڈیاں ذرا اُبھری ہوئی تھیں گردن کے نچلے سرے پر ایک بھورا تل دیدہ زیب تھا۔ پیشانی پر دائرہ نما گلابی بندیا کو اُس نے سیاہ حاشیے سے گھیر کر اُس پر ایک نکتہ بنا دیا تھا۔ اُس کے بالائی ہونٹ کے اُوپر سنہرے روئیں سے تھے نچلے ہونٹ میں بار بار جنبش ہو رہی تھی۔ اُس کے بچیلے دانت چمک سے جاتے۔ اُس کے گلے میں طلائی زنجیر کی دو لڑیاں تھیں۔

کلائیوں سے لے کر کہنیوں تک جو اُس کے ہاتھوں کے کُھلے حصّے تھے۔ اُن پر بھی چھوٹے چھوٹے سنہرے بال تھے۔ اُس کے لمبے ناخنوں میں دلکشی تھی۔

اُس کے پپوٹے بھاری ہو چلے تھے۔

میری کنپٹیاں تمتمانے لگی تھیں۔ مٹھیاں بھینچے جاتیں۔ جسم میں سنسنی سی پھیلتی جا رہی تھی۔

نظروں میں قوس قزح کے کئی رنگ لہرائے۔

زرتار حجابوں میں تھرتھراہٹ سی ہوئی۔

افشاں کے جگ مگ کرتے ذرّے بکھر گئے۔

.... سامنے ارچنا نڈھال سی پڑی تھی۔

اُس کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر پڑے تھے۔ پنڈلیاں کچھ کھُل گئی تھیں۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ سرہانے رکھ لیا تھا۔ میرا داہنا ہاتھ ڈھلک کر صوفے کے برابر ٹیبل پر پڑا تھا۔

★ ★

ظلمتِ شب

پردہ ذرا سا ہلا تھا۔

فہمیدہ کی سہمی ہوئی نگاہوں کی سراسیمگی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اُس کی متجسس آنکھیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ نہ جانے کس کی تلاش تھی انہیں؟ کوئی نقش قدم، کچھ انجانے کارواں، کوئی شبیہ، کوئی خوابِ گم گشتہ! وہاں کسی کا مبہم سا نشان بھی نہ تھا۔ چند لمحوں کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک بڑے ہجوم میں گھر گئی ہو۔ دالان سے پرے سڑک کی جانب سے کوئی مردانہ قہقہہ اُبھرا اور گھبرا کر اُس نے پردہ سرکا دیا۔ اُس کا پورا سراپا کانپ رہا تھا اور جسم عرق آلود ہونے لگا۔

جب کبھی موقع ملتا چھپ چھپا کر وہ پردے کی اوٹ سے باہر کی اجنبی دُنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتی۔ کبھی کھڑکی پر، کبھی دروازے پر کھڑی ہو کر حسرت سے آتے جاتے لوگوں پر اُچٹتی سی نظر ڈالتی۔ سانولی سلونی، گوری چٹی عورتیں طرح طرح کی ڈیزائن والے کپڑوں میں ملبوس، ہنستے مسکراتے بچے اور بھانت بھانت کے مرد!

"ہائے اللہ! کسی نے دیکھ نہ لیا ہو!" دھڑکتے دل سے وہ سوچتی۔ کبھی مرد

کو دیکھ کانپتے ہاتھوں سے پردہ برابر کر دیتی۔ اندر کی جانب سمٹ جاتی اور جب کوئی بھاری آواز اُبھرتی، کوئی قہقہہ گونجتا تو بھاگتی دوڑتی وہ اپنے کمرے میں پہنچ جاتی اور سانسوں کا طوفان روکے نہ رُکتا۔

امّی کہتی تھیں ۔۔ مقدّس کتابوں میں لکھا ہے اور بزرگوں کا قول ہے کہ عورت پر غیر مرد کا سایہ پڑ جائے تو خدا اُس عورت کو کبھی نہیں معاف کرتا جیتے جی مصیبتیں نازل ہوں گی اور پھر مرنے کے بعد جہنّم کے شعلوں میں اُسے جلنا پڑے گا۔"

قیامت کے تذکرے، پُل صراط کے مرحلے، نفسی نفسی کی گھڑی، رُوئی کے گالوں کے مانند آسمان، سوا نیزے پر لٹکا ہوا سُورج، تانبے کی طرح تپتی ہوئی زمین ۔۔ ان سب کا چرچہ اکثر ہوتا رہتا ایسی رُوح فرسا باتیں فہمیدہ کی رگوں میں سرد سی لہریں رواں کر دیتیں۔ کبھی نیند سرے سے آتی ہی نہیں اور کبھی سوتے میں کوئی ڈراؤنا چہرہ اُس کے قریب آتا ہوا دکھائی دیتا اور وہ چونک جاتی۔ چیخ پڑتی۔ پھر دیر تک آیتہ الکرسی پڑھتی رہتی، دُعا مانگتی۔

"توبہ اللہ توبہ! مجھے دوزخ کی آگ سے بچانا۔ کوئی گناہ نہ کروں گی۔ کھڑکی سے جھانک کر اب کسی کو نہ دیکھوں گی۔ معاف کر دے ربّ العالمین! کسی مرد پر نظر نہ ڈالوں گی۔ اپنے رسول کے صدقے مجھے بخش دے مولا۔!"

وہ دیر تک بُدبُداتی رہتی۔

بچپن میں دادی جان نے بہت ساری کہانیاں سنائی تھیں، دیو پری کے قصے، جن بھوت کے واقعات شہزادے شہزادیوں کی داستانیں،

اور وہ لڑکیاں جو نیک سیرت ہوتی ہیں نماز روزہ کی پابندی کرتی ہیں۔ بزرگوں کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتیں۔ سر پر ہمیشہ آنچل ڈالے رکھتی ہیں۔ انہیں کوئی حسین و جمیل، خوبرو شہزادہ بیاہ کرنے جاتا ہے۔ پھر وہ ساری زندگی عیش کرتی ہیں۔ نہ جانے کب سے فہمیدہ کو اس شہزادہ کا انتظار تھا سوتے جاگتے اکثر ایک اجنبی سا ہیولے اُس کی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگتا۔ بڑی بڑی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، باریک مونچھیں لمبا قد، زرق برق لباس، ہاتھ میں تلوار ـــــ شہزادہ گھوڑے سے اُتر کر فہمیدہ کی جانب بڑھتا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اور...... اور پھر شرما کر، ہولے سے مسکرا کر وہ اپنی باہوں میں سمٹ جاتی۔ چند ثانیے کے بعد چونک کر اردگرد نظر ڈالتی۔ کسی نے اُسے اِس طرح مسکراتے دیکھا تو نہیں؟ ہشش، پاگل کہیں کی، کوئی بھی تو نہیں! اُسے قدرے اطمینان ہوتا۔

دادی جان سے سُن سُن کر کتنی کہانیاں اُسے بھی یاد ہو گئی تھیں۔ ہمّی کو وہ بڑے چاؤ سے سُناتی۔ ایک تھا راجہ، ایک تھی رانی۔ ایک تھا ظالم دیو اور ایک تھی رحم دل پری۔ ایک بادشاہ کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ سات سمندر پار کوہِ قاف پر جنوں کی حکومت تھی...... ہمّی بولتی جاتی...... ہوں...... ہوں......

دونوں کے لہجے سے غنودگی ٹپکنے لگتی، پھر بے کراں خاموشی چھا جاتی۔

بیس بائیس کے سِن میں تو لڑکیوں کو جاگتے میں بھی خواب نظر آتے ہیں۔ فہمیدہ خیالوں میں ہمیشہ اُلجھی رہتی ـــــ سویٹر بُننا کوئی آسان بات ہے کیا! انگلیاں دکھنے لگیں۔ کمر اکڑ گئی۔ آپ بھیّا ضد کر رہے ہیں تو جمعہ تک

اُسے پورا ہی کرنا ہوگا۔ بس یہ پھول اتار لوں تو نہاؤں گی۔ نہائے ہوئے کئی دن ہو گئے۔ پسینے سے بلاؤز بھیگ جاتا ہے۔ کیسی عجیب سی بُو آتی ہے جی چاہتا ہے اسے سونگھتی رہوں لیکن مُنّی کہتی ہے۔

"چھی! آپا چھی! کتنی گندی ہو تم! تمہارا بدن سڑانڈ کر رہا ہے۔ کپڑے چیکٹ ہو گئے ہیں!"

مُنّی کی بچّی! شریر کہیں کی، ننھّی نادان ہے نا۔ اسی لئے چینی کی گڑیا بنی پھرتی ہے۔ ذرا سیانی ہو جائے۔ اِتنے سارے کام کرنے پڑیں تب معلوم ہوگا نفاست کسے کہتے ہیں۔

"فہمی! آؤ بیٹی کھانا نکالو۔ تمہارے ابّا آ گئے۔"

"جی! آئی امّی!"

کبھی دن کوئی نئی بات ذہن سے اُلجھ کر اُجاگر ہوتی۔ کچھ تشکیک سر اُبھارتے کچھ پہیلے جید گیان جنم لیتیں۔ مُنّی پوچھتی ہے ——— آدمی دُنیا میں کہاں سے آتا ہے؟

دادی جان کہتی تھیں ...

اللہ میاں آدمی کو مٹی سے بناتے ہیں اور اس میں رُوح ڈال دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد رُوح آسمان پر چلی جاتی ہے۔ دادی جان مر گئیں۔ اُن کی رُوح بھی عرش پر ہوگی۔ شب برات کو مردوں کی رُوحیں اپنے گھروں کو آتی ہیں مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ قبر میں فرشتے آئیں گے۔ روزِ حشر اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ اللہ! بھیّا کو عذاب سے بچانا۔ کیسی اُول جلول کتابیں پڑھتے ہیں۔ اُس کے بازو سڈول تھے اور نانے کے نیچے تک ننگی تھی۔ رمیش نے چادر

کو سینے سے لگا لینا چاہا اور اس کے ہونٹ چوم لینا چاہا۔

اللہ توبہ! میں اس کے آگے نہ بڑھ سکی۔ مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔

مجھے تم سے محبت ہے۔ ریک میں رکھا اور دوڑ کر اپنے کمرے میں پہنچی۔ منی وہیں تھی کہنے لگی۔

"آج بہت خوبصورت نظر آرہی ہیں آپا!"

"ہش! آؤ ادھر آؤ"

فہمیدہ نے منی کو گود میں لے لیا۔ اور اسے پیار کرنے لگی۔

بڑے پیر صاحب کے چاند میں داتا غریب شاہ کے مزار پر عرس ہوتا تھا۔ فہمیدہ کے ابا، امی کو شاہ جی سے بہت عقیدت تھی۔ ہر سال عرس کے موقع پر وہ مزار پر حاضری دیتے، اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ خدا کی پناہ! برقعہ میں لپٹی ہوئی فہمیدہ امی کے بازو تھامے زنانے دروازے سے داخل ہوتی لوگوں کا یہ ہجوم دیکھ کر اس پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کا جی چاہتا۔ امی سے کہہ دے واپس چلئے اس کے قدم آگے بڑھنے کے لئے آمادہ نہ ہوتے۔ تب امی کہتیں۔

"آؤ نا۔ رک کیوں گئیں۔ شاہ جی سے دعا مانگیں۔ داتا سے کہوں گی تمہیں اچھا گھر دیں۔ نیک شوہر دیں۔"

سہمی سہمی ہوئی امی کے سہارے وہ آگے بڑھ جاتی۔

پاس پڑوس کی عورتیں کبھی ملنے ملانے آجاتیں۔ پرب تہوار میں رونقیں بڑھ جاتیں۔ بہت ادب سے فہمیدہ عورتوں کو بٹھاتی۔

"سلام بُوا، سلام خالہ، چچی سلام، آپا سلام، نانی سلام"۔

جیو بیٹی! خوش رہو۔ جلدی سے اچھا جوڑا مل جائے۔ سدا سکھی رہو۔

سب کی دُعائیں اُسے ملتیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

ایک بار نزہت چچی نے اُسے دیکھ کر کہا تھا۔

"ماشاء اللہ! کیا صورت پائی ہے، چاند شرما جائے!"

فہمیدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا میں اُڑ جائے گی، چہرہ سُرخ ہوگیا، لَویں دہکنے لگیں۔ ایک انوکھی لذت سے وہ سرشار ہوگئی۔ اکیلے میں کبھی آئینہ دیکھتی نئے نئے زاویوں سے اور لمحوں میں اُس کی پلکیں خود بخود جھکنے لگتیں۔ حجاب حُسن کی دلکشی دوبالا کر دیتا ہے۔ رسالوں میں چھپی ہوئی حسین تصویریں سامنے رکھکر اپنے عکس سے وہ اُن کا موازنہ کرتی۔ بالوں کی یہ لَٹ ماتھے پر جھک گئی۔ کاجل کی لکیریں اور ٹیڑھی ہوگئیں۔ پیشانی پر بندیا جگمگا اُٹھی۔ لبوں کا دائرہ بن گیا۔ اور پھر ایک انگڑائی۔ ایک سرد آہ۔ ایک خواب! شہزادہ کب آئے گا؟ شہنائیاں کب بجیں گی؟

"آپا، آپا! بھیّا آگئے۔ اپنی کتاب ڈھونڈ رہے ہیں۔ جلدی سے دیجئے چُپکے سے رکھ آتی ہوں"۔

"اوہ! وہ.....ا.....ں" سپنے منتشر ہو رہے ہیں۔

"فہمی! فہمی! ذرا سُننا اِدھر بیٹی۔ ایک گلاس پانی دو"۔

"اچھا! آتی ہوں ابا!"

میری پیاس کیسے بجھے گی ——— کیسی پیاس ہے یہ!

"چولہا جلاؤ فہمی! کچھ دوست آئے ہیں۔ چائے بنا دو۔"

کون ہوگا؟ وہی جمال ہوں گے اور اکرام اور وسیم۔ یہی لوگ تو بھیا کے خاص دوست ہیں۔ جمال، اکرام، وسیم ــــ شہزادہ کب آئے گا؟ مہندی کب لگے گی؟ اُبٹن کی خوشبو کب پھیلے گی؟ مستی کا جادو کب چلے گا؟ آخر کب؟ شہزادہ...... انتظار ــــ طویل انتظار ــــ!!

★

دُھوپ کی سُنہری کرنیں فہمیدہ کے بکھرے بالوں میں اُلجھ رہی تھیں اور نسیم کے جھونکے لٹوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ اُس کے ہاتھوں میں تیلیاں تھیں اور اُون کا گولہ اور ذہن میں خیالات کا بے ربط سلسلہ۔ مُنّی اسکول گئی تھی۔ فہمیدہ بھی جب چھوٹی سی تھی مکتب جاتی تھی۔ اُن دنوں مُناجات جھوم کر گاتی تھی۔ پھر گرلز مڈل اسکول میں گئی۔ وہاں ماجھی کا گیت سیکھ لیا۔ ساتویں کے بعد خواہش ہوئی کہ مشن ہائی اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ لیکن امّی نے ڈانٹ پلائی۔

بہت ہو گیا۔ نوکری نہیں کرنی۔ اب ہنڈیا چولہا سنبھالو۔ تم تو اس قابل ہو گئیں کہ خط وغیرہ بھی لکھ پڑھ سکتی ہو۔ ایمان کی کتاب سمجھ لیتی ہو۔ شادی ہو جائے گی، تو ہدایت نامہ بیوی پڑھ لینا...... ایک ہم لوگ تھے۔ مُشکل سے دو لفظ سیکھ سکے۔ تلاوت قرآن کر لی۔ تحیات درود جان لیا، اور تعلیم پوری ہو گئی۔ تم تو خوش قسمت ہو۔"

ابا آفس گئے تھے۔

فہمیدہ کو وہ بہت چاہتے تھے۔ تنخواہ کے دن اُس کے لئے کوئی نیا تحفہ ضرور لاتے جسے اُس کے جہیز کے لئے محفوظ کر دیا جاتا۔ ہمیشہ اُسے کام میں لگی دیکھ کر وہ بہت شفقت سے کہتے۔

"پل بھر آرام تو کر لیا کرو بیٹی۔ ہر وقت کام کرنے سے جی گھبراتا ہوگا۔"

وہ دھیمے سے ہنس دیتی۔

"مجھے بیکار بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ "کچھ نہ کچھ کرنے سے طبیعت بہلتی رہتی ہے۔"

"بہت خوب!" وہ بھر پور قہقہہ لگاتے۔

بھیّا کے کالج کا وقت تھا۔

گھر میں صرف امّی تھیں اور فہمیدہ اور اُس کی تنہائیاں۔

وسط جنوری کی دھوپ خوشگوار تھی۔

امّی دالان سے نکلیں اور آنگن میں نلکے کے نزدیک بیٹھ کر وضو کرنے لگیں۔ فہمیدہ نے اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ظہر کا وقت ختم ہو جائے گا۔ میں بھی اب اُٹھتی ہوں۔ ذرا ان باقی گھروں کو اِس تیلی پر اتار لوں۔

امّی نے تولیے سے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اُٹھو بیٹی اذان ہوئے دیر ہوئی۔ بعد میں بُنتی رہنا۔"

"ہو گیا۔ بس ایک منٹ!"

اُس کی اُنگلیاں تیزی سے تیلیوں پر رقص کرنے لگیں۔ چشم زدن میں ایک دلدوز چیخ اُبھری۔ فہمیدہ کے ہاتھ سے سوئٹر گر گیا۔ اعصاب کو ایک

جھٹکا سا محسوس ہوا۔ امی دالان میں گری پڑی تھیں ایک پل کے لئے تو اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی قریب پہنچی۔ امی کی ناک سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر تشنج کے آثار نمایاں تھے۔ فہمیدہ کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ دل کی دھمک دماغ تک پہنچ رہی تھی۔ یکایک اُس کی زبان تالو میں چپکنے لگی۔ جبڑے کسنے لگے۔ ایک بھیانک آواز بلند ہوئی۔ وہ دوزانو بیٹھ گئی امی کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ناک سے خون کی دھار اجاری تھی۔ اُس نے اپنا دوپٹہ پھاڑ ڈالا۔ ناک کے سوراخ پر کپڑا رکھ کر خون پونچھنے لگی۔

وہ روئے جا رہی تھی۔

"یا اللہ! مدد کر۔ پچاس رکعت نفل پڑھوں گی۔ امی کو ٹھیک کر دے۔ پروردگار! اپنے نبی کے صدقے...... امی!"

"اختر! اختر بھائی ہیں؟ دروازہ پر کسی نے پکارا۔

فہمیدہ نے آنسو پونچھے۔ جمال ہیں شاید۔ انہیں بلاتی ہوں۔ دیکھیں تو امی کو کیا ہو گیا ہے — یا اللہ مدد!

باہر سے کئی بار آواز آ چکی تھی۔ فہمیدہ چلمن کے نزدیک گئی۔ جمال واپس جانے کے لئے مڑ رہے تھے۔ کیا کہوں اُن سے؟ کس طرح کہوں؟ کبھی بات نہیں کی کیا سوچیں گے؟

جمال آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

"سنئے......" جانے کس طرح وہ چیخ پڑی۔

جمال نے گھوم کر دیکھا۔ پردے کے پاس کوئی تھا۔ وہ واپس آنے لگا
یا اللہ! وہ آرہے ہیں، کیا کہوں گی، امّی..... خون..... غیر مرد......
شہزادہ..... غیر مرد..... عذاب..... شہزادہ..... امّی.....
یا مولیٰ!!

جمال پردے کے قریب آ گئے۔

"کیا بات ہے؟ اختر ابھی کالج سے نہیں آئے کیا؟"

فہمیدہ کے گلے میں کانٹے چبھنے لگے۔

"امّی.....!"

اُس نے چیخ ماری، وہ کانپ رہی تھی۔

پردہ ہٹا۔ جمال سامنے تھے۔ فہمیدہ کو ایسا معلوم ہوا یہ زمین، یہ چھت یہ ساری چیزیں ناچ رہی ہوں۔ اُن کے کان بجنے لگے۔ اُس کا سرا یا لہرایا۔ اور..... اور پھر وہ جمال کے سینے سے لگ گئی۔ ساکت، بے حس۔ اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ شہزادے کے لبوں پر ایک انوکھی مسکراہٹ تھی۔

★ ★

نظر نظر کی بات

اور میاں فخرالدین مولوی بن گئے۔

اُن کی دیرینہ تمنا تھی کہ پڑھ کر قوم کی کچھ خدمت کر سکیں۔ عالم فاضل کی سند ملتے ہی محمود نگر مڈل اسکول میں انھیں ملازمت مل گئی۔ پھر تو ایسا ہوا کہ اُن کی پڑھائی کی تعریف میں محمود نگر مڈل اسکول کی دیواریں تک گن گنانے لگیں۔ لڑکوں نے اُن کی تعریف کی۔ مدرسوں نے انھیں سراہا اور صدر مدرسی نے اُن کی پیٹھ ٹھونکی۔ مولوی فخرالدین پھولے نہیں سماتے تھے۔ انھوں نے اور بھی محنت کی۔ محنت اور ایمانداری کو تعریف کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر مدح و ثنا کے محنت کو زنگ لگ جاتی ہے۔ اور ایمانداری کے پیکر میں گھن لگ جاتا ہے۔

مولوی فخرالدین علامہ اقبال کے رسیا تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ زندگی میں اگر انھوں نے کچھ سیکھا ہے تو وہ اقبال کا فلسفہ ہے۔ صوم و صلوٰۃ کی بات ہو۔ پڑھائی لکھائی کا سلسلہ ہو۔ یا دنیاوی معاملات، مولوی صاحب اقبال کا حوالہ ضرور دیتے۔ اُن کی زندگی بڑی پاک زندگی تھی پڑھنا اور پڑھانا بس یہی اُن کے دو مقاصد تھے۔ کام کے وقت شاگردوں

میں ٹھہرے رہتے اور فرصت کے وقت کتابیں ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھیں نہ کسی کا لینا، نہ کسی کا دینا۔ اِدھر اُدھر کی شکایت اور نہ ہی قسمت کا رونا۔ مُلکی، غیر مُلکی سیاست اور نہ ہی دُنیا جہاں کی بُحرانی حالات کا تذکرہ۔ کسی بات سے اُنہیں غرض نہ تھی۔ گھر کے اکیلے فرد تھے۔ جورُو نہ جاتا۔ لے دے کر بس اکیلے دم تھے۔ چولھا چکّی کے لئے باپ دادا کے وقت کا ایک بوڑھا نوکر اُن کے ساتھ برسوں سے رہتا آیا تھا۔— مولوی صاحب اُسے بابا کہتے تھے۔

بابا کہتا تھا مولوی صاحب اُس کی گود میں کھیلے ہیں۔ جب کبھی بابا کو سُرور آتا۔ مولوی صاحب کے بچپن کے کچھ دلچسپ واقعات سُنا کر وہ بڑا خوش ہوتا۔ بوڑھا ہونے کی وجہ سے اور سب باتیں تو اُس کے ذہن سے آہستہ آہستہ نکلتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایک بات وہ مرتے دَم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ میاں فخرالدین جب ڈیڑھ سال کے تھے۔ بابا اُنہیں سینے سے لگا کر سویا تھا۔ اچانک جب گرم گرم سی کوئی سَیّال سی شے اُس کے چہرے پر گری تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میاں فخرالدین بڑے خوش تھے۔ اُن کا جانگیہ بھیگا ہوا تھا۔ اور وہ.... مولوی صاحب کو بچپن کی یہ بات سُن کر بہت شرم آتی۔ اُنہیں شُبہ ہونے لگتا کہ آیا درحقیقت انھوں نے کبھی ایسی بدتمیزی کی تھی۔ بابا کو اور بہت ساری باتیں یاد تھیں۔ کبھی کبھی جب وہ اگلے وقتوں کی یادوں سے مسرور ہوتا تو بڑا چہکتا۔ پھر اُس کی آنکھیں بھر آتیں— فسادات کا سارا نقشہ اُس کی آنکھوں تلے اب بھی

ناچ اٹھا۔

مولوی فخرالدین اُس وقت ننھی سی جان تھے۔ اُنہیں اپنے ماں باپ یا گھر کے کسی فرد کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ بابا کی نگاہیں ماضی کے اندھیروں میں جہاں تک کچھ دھندلے دھندلے نقوش پا سکتی تھی اُن کا تعلق فخرالدین اور اُن کے گھر بار سے تھا۔ اُسے اپنے آقا میاں نصیرالدین کی کرم فرمائیاں اب بھی بہت یاد آتی تھیں۔ میاں نصرالدین کی کلکتہ میں بہت بڑی دکان تھی۔ ہزاروں کا کاروبار تھا۔ کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ زندگی بڑے مزے میں گذرتی تھی۔ میاں نصرالدین نے جو کچھ مال و دولت پیدا کیا۔ سب اپنی قوت بازو سے کلکتہ کے فٹ پاتھ پر ہر مال ملے گا چھ آنے چلاتے چلاتے ایک بڑے اسٹور کے مالک بن گئے تھے کئی کئی نوکر چاکر رکھے گئے۔ دکان کے لئے اور گھر کے لئے بھی۔ میاں نصرالدین نے پھر تو اپنی خالہ کی ایک عزیزہ صابرہ خاتون کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ دن کو وہ بزنس کی دوڑ دھوپ میں لگے رہتے اور گئی رات کو تھک کر چور ہو کر جب نصر منزل میں پہنچتے تو ایک نئی دُنیا آباد ہو جاتی۔ عورت کی باہیں مرد کے لئے کتنی سکون پرور ہوتی ہیں۔

شادی کے پورے نو سال کے بعد دعاؤں، تعویذوں اور گنڈوں کا اثر ہوا تھا، اور صابرہ خاتون کی گود میں فخرالدین نے آنکھ کھولی تھی۔ میاں نصرالدین کتنے خوش تھے ـــــ سوچتے تھے دُنیا جہان کی خوشی اُن کے دامن میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ فخرالدین کے مستقبل کے لئے انھوں نے کتنے منصوبے بنا ڈالے ـــــ ڈاکٹر فخرالدین، انجینئر فخرالدین، سیٹھ فخرالدین،

......نہیں! نہیں!! ...... منسٹر فخرالدین! گورنر فخرالدین، کمشنر فخرالدین ـــ نہیں یہ سب نہیں ـــ پروفیسر فخرالدین، بیرسٹر فخرالدین اور جانے کیا کچھ......

بابا کہتا تھا فخرالدین اُس وقت دو برسوں کے ہوں گے. کلکتہ میں ہندو مُسلم فساد ہو گیا. نصر منزل اور نصرالدین جنرل اسٹور کو بلوائیوں نے کباڑ خانے میں تبدیل کر دیا ـــ نصرالدین اور صابرہ خاتون کو کس بیدردی سے ذبح کیا گیا تھا ـــ! بابا کو جب کبھی وہ منظر یاد آتا وہ کانپ کانپ جاتا. بڑی مشکل سے فخرالدین کو گلے سے چمٹائے ہوئے وہ خونخوار درندوں کے جنگل سے بچا تھا.

میاں فخرالدین عالم، فاضل بن کر اب مولوی فخرالدین بن گئے تھے. ظفر احمد اُن کے رشتہ کے چچا ہوتے تھے. یہ اُن کی مہربانیاں تھیں کہ کلکتہ کی نصر منزل اور نصرالدین جنرل اسٹور کو خستہ حالی ہی میں بیچ دیا گیا. ظفر احمد غازی آدمی تھے. دُنیا دار کم تھے. اور خدا پرست زیادہ! فخرالدین کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے. قصبے کے مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد فخرالدین کو ندوۃ العلوم میں داخل کرا دیا گیا. اور امتیازی شان سے امتحانات پاس کرنے کے بعد مولوی فخرالدین اب محمود نگر مڈل اسکول کے مدرس تھے.

بابا اب بوڑھا ہو چلا تھا. لیکن اُس کی کمر میں ذرا سا خم بھی نہ تھا. اُسے اپنے روپئے سیر گھی کھانے پر فخر تھا. مولوی فخرالدین کا سارا کام کاج بابا ہی کرتا. مولوی صاحب کی علمیت اور شخصیت کا چرچہ محمود نگر قصبہ کے گھر گھر میں

تھا۔ سب لوگ یہی کہتے ایسا قابل اور سیدھا سادہ آدمی اب مشکل ہی نہ ملے گا۔ نئی روشنی اور نئے زمانہ میں ہوش سنبھالنے کے باوجود مولوی فخرالدین اپنے علاوہ ہمیشہ دوسروں کے لئے سوچا کرتے۔ انہیں ہمیشہ بس یہی فکر دامنگیر رہتی۔ اُن سے کسی کو شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اُن سے جہاں تک ہو سکتا ہمیشہ ہر کسی کی خدمت کے لئے کمربستہ رہتے، اپنی قلیل آمدنی میں انھوں نے بہتوں کا بھلا کیا۔

تنگ حال لڑکوں کی انھوں نے ہمیشہ مدد کی۔ آج کسی کو کتاب خرید دی کل کسی کی فیس دے دی۔ کبھی کسی کے لئے کپڑے سلا دیئے کبھی.... مولوی صاحب بڑے دل گردہ کے آدمی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ایک جوڑ پاجامہ اور کرتے میں کام چلا لیے۔ جاڑے کے دنوں میں اتنی تبدیلی آجاتی کہ رُوئی میں لپٹی ہوئی ایک بنڈی کرتے کے اوپر چڑھا لیتے۔ اگر جاڑے کی شدت بڑھ جاتی تو کھادی کی چادر اوڑھ لیتے۔ اُن کی ساری کفایت شعاری دوسروں کی بھلائی کے مقصد سے ہوتی، جو کچھ پیسہ وہ بچا سکتے تھے۔ اُس کا مصرف دوسرے لوگ ہی لیا کرتے۔ دوسروں کی تکلیف سے اُنہیں دُکھ تکلیف ہوتی۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچا کر وہ ہمیشہ خوش ہوتے۔ اُن کی زندگی مثالی تھی۔ اُن کا ایک آدرش تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا مولوی فخرالدین کم سے کم اس صدی کے آدمی تو نہیں۔ بڑا عظیم کردار تھا اُن کا۔

مولوی صاحب کے جتنے شاگرد تھے، سب اُن پر جان چھڑکتے تھے محمود نگر مڈل اسکول سے فارغ ہونے کے بعد بھی طلبا ہمیشہ اُنہیں یاد

رکھتے۔ اُن کے طور طریقے اُن کی زندگی کو ہمیشہ متاثر کرتے رہتے۔

مولوی صاحب کے ایک شاگرد عبداللہ جب رام پور سے تبدیل ہو کر محمود نگر آئے تو اُن کی ترقی ہو چکی تھی۔ داروغہ سے پولیس انسپکٹر بنتے ہی عبداللہ کے چہرہ پر کچھ اور نکھار آگیا تھا۔ مولوی فخرالدین کو اُس دن کچھ عجیب سی خوشی کا اندازہ ہوا۔ ایک انسان جب ترقی کرتا ہے تو پوری نسل آگے بڑھتی ہے، پوری قوم ترقی کرتی ہے۔ مولوی صاحب بڑے نازاں ہوئے۔ فخر سے اُن کا سینہ پھول گیا۔

پہلے تو کئی دنوں تک مولوی صاحب نے انتظار کیا کہ عبداللہ اُن سے ملنے ضرور آئے گا۔ پھر وہ سوچتے، پولیس والے بڑے مشغول ہوتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ پولس انسپکٹر عبداللہ اور مولوی فخرالدین میں کتنا فرق ہوتا ہے ایک کو دوسرے کی کیا ضرورت۔ پھر دونوں کیوں ملنے لگے۔ مگر مولوی صاحب اپنے شاگرد رشید سے ملنے کے لئے بہت بے چین تھے۔ ایک دن اسکول سے چھٹی ملنے کے بعد انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ عبداللہ سے ضرور ملیں گے۔

دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی شام کو مولوی صاحب نے اپنا کرتا پائجامہ زیب تن کیا۔ رُوئی کی بنڈی چڑھائی اور کھادی کی چادر اوڑھ کر تھانہ کی طرف چل پڑے۔ انسپکٹر عبداللہ نے مولوی صاحب کو پہچاننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ مشکل تو مولوی صاحب کو ہوئی۔ پندرہ سال کے اندر انسان کی شکل وشباہت کتنی بدل جاتی ہے!

انسپکٹر عبداللہ نے مولوی فخرالدین کی چائے بسکٹ سے تواضع کی

اور اپنے چار عدد لڑکے لڑکیوں سے تسلیم کہلوایا۔ مولوی صاحب نے سب کو دُعا دی۔ چلتے چلاتے عشار کا وقت ہوگیا۔ مغرب کی نماز انھوں نے انسپکٹر عبداللہ ہی کے یہاں ادا کی۔ رات کا آنچل بھیگتا جا رہا تھا۔ ہوا یخ بستہ تھی

"مولوی صاحب! کبھی کبھی آیا کیجئے۔ یہ سب آپ ہی کے بچے ہیں! ذرا انہیں بھی لکھائیے، پڑھائیے"۔ انسپکٹر عبداللہ نے کہا — پھر انہیں کچھ یاد آیا، سردی کی شدت اور مولوی فخرالدین کے جسم پر برائے نام کپڑے، انسپکٹر عبداللہ کا ذہن اپنی طرف کھینچ چکے تھے۔ انھوں نے اپنے نوکر کو آواز دی۔

"بھولا! ارے بھولا —— مالکن سے بولو کہ پچھلے برس میرے سبز رنگ کے جس کوٹ کے کالر کو چوہے نے کتر دیا تھا، اُسے بکس سے نکال دیں۔

بھولا کوٹ لے آیا۔

انسپکٹر عبداللہ نے اُسے مولوی فخرالدین کو دیتے ہوئے کہا۔

"مولوی صاحب! اِسے میں نے صرف تین سال استعمال کیا ہے۔ ذرا اِس کا کالر مرمت کرا لیجئے گا تو کم سے کم سات آٹھ برس تک آپ کے کام آئیگا"۔

مولوی فخرالدین نے شاید زندگی میں اتنی شرمندگی اور بیچارگی کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اُن کا ذہن کھول اُٹھا۔ آخر اِس عبداللہ کے بچے نے سمجھا کیا ہے اپنا نوکر، بھیک منگا۔ بھکڑ، محتاج —— یہ اُترن کا کوٹ مجھے دیتا ہے۔ کیوں کیوں ——؟ مولوی فخرالدین ایسے کتنے ہی کوٹ بنوا سکتا تھا۔ یہ اُترن کا کوٹ! یہ عبداللہ تو میرا بڑا ہی نالائق شاگرد نکلا۔ بدتمیز کہیں کا! —— مشکل سے وہ خود پر قابو پا سکے۔

"مجھے کوٹ سے وحشت ہوتی ہے۔ سردی سے مدافعت کے لئے میری چادر کافی ہے۔" وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

پھر وہ پلٹے اور جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے محمود نگر مڈل اسکول کی طرف بڑھنے لگے۔

انسپکٹر عبداللہ نے کوٹ اپنے کاندھے پر رکھا اور سر اونچا کرتے ہوئے کہا۔

وہاٹ اے فُول! کُھند کہیں کے۔ اِل ایڈوکیٹڈ — اِل مینرڈ! ہونہہ! اسی لئے تو مولویوں سے مجھے چڑھ ہے۔ بیچارے مولوی!!

"کاہے کو سردی میں کھڑے ہیں انسپکٹر صاحب"! رامو چوکیدار نے انسپکٹر عبداللہ کو خیال کے تانے بانے سے باہر نکالا۔

"اوہ! تم رامو! تمہیں سردی نہیں لگتی کیا؟"

"غریبوں کے لئے سردی گرمی سب برابر ہے — سرکار! چادر کا بھی ہے مجبور۔"

"نہیں نہیں! سردی بڑی زوردار ہے۔ تمہیں رات بھر جاگنا بھی تو پڑتا ہے ٹھنڈ لگ جائے گی۔ لو یہ کوٹ پہن لو۔"

دھنیہ سرکار! بھگوان آپ کو اور ترقی دے! آپ بڑا صاحب سے بھی بڑا صاحب بن جائیں۔ انسپکٹر صاحب کی جے!"

انسپکٹر عبداللہ کے چہرہ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ بوجھل قدموں سے وہ اپنے کوارٹر کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اب اُن کا ذہن ہلکا ہو چکا تھا۔ **

مرمریں سیم تن

"بس آخری پیگ۔"

"اونہوں! ایک اور... صرف ایک..."

"نو ڈارلنگ! آئی ہیو ٹیکن ٹو مچ..... پلیز!"

وہاٹ آف دیٹ! میری خاطر...."

"ویری! تمہاری صحت کے لئے!"

سوفیہ کلارک نے شیمپین کا جام ہونٹوں سے لگالیا۔

اس کے رخسار انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے اُبھر آئے تھے۔

"...... اور یہ ہماری محبت کی بقا کے لئے!" جیمس مارٹن نے اپنا جام خالی کرتے ہوئے کہا۔

آج صوفیہ اور جیمس کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔

یہ دن اُن کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس روز دہ آفس سے چھٹی لے لیتے۔ دن بھر تفریح کا پروگرام رہتا۔ زندگی کی اداسیاں خوشیوں تلے دم توڑ دیتیں۔ سیر سپاٹے ہوتے، رنگ رلیاں منائی جاتیں، جام چھلکتے

وفا کی اور اُلفت کی قسمیں کھائی جاتیں۔ — مقدس باپ کے مجسمہ کے رُوبرُو گھٹنے ٹیک کر دونوں مستقبل کی خوشی اور سکون کے لئے دُعائیں مانگتے — اس گھڑی صوفیہ کا سارا بدن یخ بستہ ہو جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہُوا کہ چرچ کے سناٹے میں اور پُر سکون خاموشی میں اس پر احساس گناہ طاری ہو جاتا۔ وہ لجاحت اور شرمندگی سی محسوس کرتی۔ پھر یوں ہوتا کہ کوئی مشفق اور مہربان ہاتھ دھیرے دھیرے اس کے چہرے کو اُوپر کی جانب اُٹھانے لگتا۔ سامنے مقدس باپ کی نورانی صورت ہوتی جہاں غم و غصہ کی کوئی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ ہولی مدر کی معصومیت اس سے سرگوشیاں کرتی۔

"میری ننھی بچی! ہم تم سے خوش ہیں! بے چین مت ہو۔ ہم تمہیں دائمی اطمینان سے نوازیں گے۔"

صوفیہ کی آنکھوں کے گوشے نم ہو جاتے۔

جیمس اُسے سہارا دیتا۔ آہستہ آہستہ چرچ کی سیڑھیوں سے وُہ اُترنے لگتے۔

گھریلو ماحول کی دُھندلی یادیں کچھ خستہ، کچھ تازہ رنگوں کے امتزاج سے اب بھی صوفیہ کی نگاہوں میں رقص کرتی تھیں... جہان کلارک اُس کے بابا تھے۔ کمزور، بوڑھے، کھانستے ہوئے۔ لال، عجیب سی مہک والی دوا پیتے ہوئے۔ اُن کی آنکھیں ہمیشہ سُرخ سُرخ رہتیں، اور جب وہ بولتے تھے تو زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ ایسا لگتا کہ اُنہیں نیند آرہی ہو یا یوں کہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر وہ ایسے راستے پر جا رہے ہوں جہاں چھوٹے بڑے ڈھیر

سارے گڈھے ہوں۔ اور خدشہ ہو کہ ذرا سی بے احتیاطی انہیں کسی گہری کھائی میں گرا دے گی ـــــ ممّی کو اُس نے دیکھا نہیں تھا۔ آنٹی نے بتلایا تھا کہ اُس کی ممّی بہت خوبصورت تھیں اور بہت نازک جیسے گلاب کی کلی۔ ایسی شفاف کہ جیسے شبنم کا قطرہ! اکثر خوابوں میں ایک حسین سی پری آتی اور اُسے چومتی۔ باہوں میں بھینچتی اور تب صوفیہ تکیہ کو دبوچ کر زور سے چلا اٹھتی۔

"ممی! میری اچھی ممی! مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ کیوں روٹھی ہو......؟
ممی آؤ نا.... آؤ.... مت.... جاؤ.... مت جاؤ، ممی! ممی!!"

اُس کی ہچکیاں دیر تک قائم رہتیں۔ پھر ہولے ہولے تھپکیاں دے کر ٹریزا اُسے سُلا دیتی۔ یتیم خانہ کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی۔ صرف ٹریزا کے بازوؤں میں سمٹ کر اُسے ممّی کے وجود کا اور قرب کا احساس ہوتا اور وہ سب کچھ بھول جاتی۔ پاپا کی سُرخ سُرخ پھیلی ہوئی بھیانک آنکھیں گھنی مونچھوں کے اندر دبے ہوئے موٹے لبوں پر رقصاں مکروہ ہنسی، اُن کا اکڑا ہوا سرد جسم، اپنی روتی بلکتی آواز۔ رشتہ داروں کی سرد مہری، بیگانگی خود غرضی...... ٹریزا اس کی راز دار تھی۔ دوست تھی۔ سب کچھ تھی ـــ صوفیہ بچپن کی حدوں کو پھلانگ کر شعور کی وادی میں پہنچ گئی لیکن ٹیڑھے میڑھے راستوں سے، جہاں کسی کی چاہت نہیں تھی، تمنا اور پیار نہیں تھا صرف پیاس تھی ـــــ پیاس! اگرچہ یتیم خانہ میں لاوارث بچوں کی پرورش و پرداخت، اِس لئے کی جاتی تھی کہ وہ بڑے ہو کر فادر، برادر، سسٹر اور مدر بنیں۔ گرجا گھروں میں راہبانہ زندگی بتائیں۔ خود گناہوں سے بچیں اور

دوسروں کو صحیح راستہ بتائیں۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے کوشاں رہیں اپنے نفس پر قابو رکھیں، کیونکہ یہ سارے جھمیلوں کی جڑ ہے۔ یہی بنی نوع کی نجات کا ذریعہ ہے صوفیہ اسی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی لیکن جیمس کی شخصیت بجلی بن کر چمکی اور صوفیہ کو جلا کر راکھ کر گئی۔ وہ نڈھال نڈھال اس کے کاندھوں سے سر ٹکائے کھڑی رہی اور جیمس کہتا رہا۔

"چلو، صوفیہ! ہم ایک نئی دنیا میں چلیں، حقیقت کی دنیا میں! یہاں ہماری روح پر پابندیاں ہیں۔ نگاہوں پر دھندلاہٹوں کا نقاب ہے۔ ہمارا ذہن مقید ہے۔ دیکھنے کی آزادی ہے نہ سننے کی۔ نہ سوچنے کی۔ آؤ ہم ان زنجیروں کو توڑ ڈالیں، میرے اور تمہارے درمیان جو یہ فاصلے ہیں، آؤ ہم ان کو ختم کر ڈالیں۔ آؤ..."

اور صوفیہ سمٹی سمٹائی خاموشی خاموشی جیمس کی باہوں میں دبی رہی۔ دونوں نے شادی کر لی۔

صوفیہ کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے جیمس سر سبز وادیوں میں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے فردوس کی بہاریں دیکھ لیں اس کے رخساروں کی قوس قزح میں حسن کی ساری رعنائیاں سمٹ آئی تھیں۔ جب صوفیہ کی سانسوں میں جیمس کے جسم کی خوشبو گھلنے لگتی تو اس کے ذہن کے سارے دریچے بند ہو جاتے اور احساس کی شمعیں روشن ہو جاتیں اور اسے ایسا لگتا جیسے کوئی ہولے ہولے تھپکیاں دے رہا ہے ایک عجیب سا سرور وہ محسوس کرتی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پلکیں بوجھل ہو جاتیں، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگتے۔

اور جمیس کے بازوؤں میں مسکراتی ہوئی وہ سو جاتی لیکن وہ ایک لمحہ جو اُس نام کی بیگانگی کو ختم کر کے دونوں کو ایک کر دے، اُن کی گرفت میں کبھی نہ آسکا۔

جمیس صوفیہ کے حُسن سے متاثر تھا۔ اُس کے جسم کی آنچ، ہونٹوں کے لمس، آنکھوں کی مے، جِلد کی تابناکی، گردن کا خم، اور بانہوں کا گداز——— وہ سب سے آشنا تھا لیکن جب بھی اُس نے چاہا اُن کے آگے بھی کسی منزل کا سُراغ پائے، کیونکہ اُس کا اسے اختیار تھا اور حق بھی اور اُس کا وہ اہل بھی تھا....

......صوفیہ تڑپ کر الگ ہٹ گئی، اُس پر غنودگی طاری ہو گئی بے حس و حرکت ہو کر اُس نے زور زور سے سانسیں لیں اور جمیس کی آرزوئیں پھڑپھڑاتی رہ گئیں

جمیس کے فیملی ڈاکٹر نے معائنہ کیا لیکن صوفیہ کو کوئی بیماری نہ تھی۔ ڈاکٹر نے صرف یہ ہدایت کی کہ ایسے موقع پر زور زبردستی نہیں دکھانی چاہئے....

......یہ بات نہیں تھی کہ جمیس کے لئے صوفیہ کی محبت میں کوئی کمی آئی ہو یا اُس کی لطافتوں کا مرکز کوئی دوسری شخصیت ہو گئی ہو جمیس بھی صوفیہ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ البتہ مبہم مایوسیوں اور خالی خولی محبت نے اُسے کچھ زیادہ اُداس اُداس بنا دیا تھا۔ اب وہ خوب شراب پیتا اور زیادہ سے زیادہ خود کو مشغول رکھتا ـــ اور پھر دونوں ہنستے مسکراتے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو جاتے۔

دونوں کے دلوں میں کسی قسم کے شک بھی نہیں تھے۔ باہمی محبت کے لئے اعتماد سب سے اہم بنیاد ہے۔

★

جمیس انتظار کرتا رہا، کبھی تو صوفیہ راہ پر آئے گی۔ ہر معاملے میں اُس

نے پہل کی۔ بے پناہ کوششیں کیں۔ نشے کی حالت میں وہ بہک گئی، لیکن اُس کی سرد مہری کبھی نہیں ختم ہوئی تھی۔ جیمس جذبات کے بھنور میں پھنسا رہا، زندگی یونہی ہمک ہمک کر آگے بڑھتی رہی۔ جانے ستاروں کی گردش تھی یا اُس کی اپنی گھٹن کی وحشت! ایک شام جیمس پر ہارٹ اٹیک ہوا اور اُس کی ہنسی کا چراغ بجھ گیا۔

★

تالیوں کی گونج جب تھم گئی اور لوگوں کے جوش کا پُرشور دریا جب ساکت ہوا تو آنند کرشن نے اپنی آواز کا جادو جگانا شروع کیا۔ نہ جانے یہ کس قسم کا سحر تھا۔ ہر طرف بے پناہ خاموشی چھا گئی۔ سُننے والوں کی دھڑکنیں جوان ہوگئیں۔ اُن کی نگاہوں میں صدیوں کے خواب گھٹنے لگے۔ رگوں میں آتشیں سیّال کی گرمی محسوس ہونے لگی اور ہوش و حواس منجمد ہوگئے۔ سرور اور مدہوشی اور غنودگی کی لہروں نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صوفیہ کے دل میں آنند کے لئے ایک عجیب سی خواہش جنم لینے لگی۔

فن کو حُسن نے ہمیشہ زندگی بخشی ہے۔ اور فنکار کے اضطراب کو سکون عطا کیا ہے۔ آنند بھی صوفیہ کے قریب آتا گیا۔ اُس کے گیتوں کی جاذبیت اور نغمگی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ جب صوفیہ اُس کے قریب ہوتی اور اُس کی مُسکراہٹ کی دلفریبی، عطر بیز زلفوں کی بکھری ہوئی لٹیں، آنکھوں میں تیرتی ہوئی مستی، رخساروں پر پھیلی ہوئی شفق اور نرم ہتھیلیوں کی دھیمی دھیمی آنچ سے وہ دیوانگی کی سرحدوں کو پار کرکے دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ہولے

ہوئے دِلوں کے تار کو بھیڑ دیتا ۔۔۔۔۔۔ صوفیہ ان حسین لمحات میں کھو جاتی۔

ایک حسین شام کی تنہائی میں آنند نے صوفیہ کے سامنے جب اپنے جذبات کا اظہار کُھلے الفاظ میں کیا تو اُس نے محسوس کیا ۔۔۔ جیسے وہ پھول سے زیادہ ہلکی ہو گئی ہو۔ اُس کی نس نس میں سرشار رچ گئی اور اُس کی پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی:

"آئی لوّ یو! ڈارلنگ!"

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم سے ہٹ کر میری آواز کی دلفریبیاں بے جان ہو جائیں گی۔ میرے گیتوں پر خزاں آجائے گی۔ میری رُوح بے قرار ہو کر، سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ میری منزل! میری زندگی!!

مجھے پناہ دو۔" آنند کے لہجہ میں ایک انجانی تڑپ تھی۔

صوفیہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

آنند کے بازوؤں کا حلقہ اُس کے گرد کسنے لگا۔

صوفیہ کے مرتعش اعضا برف کی مانند سرد ہو گئے۔ جذبات کی گرمی نے آنند کے رگ و پے میں طوفان مچا دیا اور یکایک صوفیہ کی کھوئی ساری طاقتیں عود کر آئیں۔ وہ آنند کی باہوں سے پھسل پڑی۔

صوفیہ کے دل میں آنند کی محبت پروان چڑھ چکی تھی۔ لیکن یہ محبت صرف احساس کی مبہم دھاروں پر بہہ سکی تھی۔ جس نے سرور دیا تھا، لذت نہیں دی تھی۔

★

۔۔۔۔۔ اور اب رشید خاں صوفیہ کی زندگی میں داخل ہونے والا تیسرا

مرد تھا۔ ملٹری میں پانچ برسوں تک پریڈ کرنے کے بعد وہ سیکشن کمانڈر ہی سکا تھا۔ اُس کی موٹی موٹی کلائیاں اور چوڑا چکلا سینہ، بلند وبالا قامت بہت کشش رکھتے تھے۔ چہرے مہرے سے گنوار پن ظاہر تھا اور لب ولہجہ بدتمیزی کی حدوں کو بھی پار کر جاتا تھا۔

رائل تھیٹرز کے بُکنگ کاؤنٹر پر صوفیہ اور رشید خاں کی پہلی ٹکر ہوئی غلطی رشید خاں کی ہی تھی۔ فوجی بوٹ سے کسی نازک حسینہ کا پھول جیسا پاؤں کچل جائے تو وہ ایڈیٹ سوائن، ہین اور اس کا ڈنڈرل، جیسے ناموں سے ضرور نوازے گی۔

خطابات نئے تو نہیں تھے۔ لیکن رشید خاں کی غیرت جوش میں آگئی اور اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اُس کے کھردرے ہاتھ اس خوبصورت گلاب جیسے رخسار والی لڑکی کو طمانچہ مارنے کے لئے نہیں بنے ہیں۔ اُن سے تو رائفل کے بٹ پکڑے جاتے ہیں۔ اُس کے ہاتھ جب اُٹھ گئے تو جھکے نہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس مار کا جواب صوفیہ درجنوں گالیوں سے دیتی یا اپنی اونچی ایڑی کی سینڈل کو استعمال کرتی یا پولیس کو ہی بلا لیتی۔ اُس نے کچھ نہیں کیا، صرف رشید خاں کو گھورتی رہ گئی۔ اُس کے ذہن میں بے شمار گھنٹیوں کی جھنکار گونج اُٹھی۔ رشید خاں نے ایک گندی گالی دی اور انٹرنیس کی جانب مڑا۔ صوفیہ بھی اُس کے پیچھے لپکی۔

"یُو سویٹ اینڈ بولڈ ہین! کم آن لیٹ اَس گو بیک"

اُس نے مضبوطی سے رشید خاں کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور بے دھڑک۔

بولتی جا رہی تھی۔ جانے کب کی کھوئی بہاریں لوٹ آئی تھیں۔ کتنے ارمانوں کے دیپ جگمگا اٹھے تھے۔ ان دیکھے سپنوں کی پرچھائیں ابھرنے لگی تھیں۔ رشید خان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

دوسرے لمحے دونوں تھیٹر کمپاؤنڈ کے باہر جا رہے تھے۔

★

کئی دنوں کے بعد سمندر کے کنارے ریت کے ذرّوں سے کھیلتے ہوئے صوفیہ نے رشید خاں سے کہا۔

"تم بہت شریر ہو۔۔ ذرا بھی رحم نہیں کرتے۔"

"یو بچ (You Bitch)! ہم تم پر رحم نہیں کرتے"، رشید خاں نے اکڑ کر کہا اور بڑھ کر صوفیہ کو اپنی باہوں میں لپیٹ لیا اور۔۔۔۔

اور۔۔۔۔ پھر صوفیہ نے چاہا کاش یہ لمحے کبھی ختم نہیں ہوتے۔۔۔۔۔۔۔۔
کاش۔۔۔۔ کاش!!

★ ★

پاپا کہاں ہیں؟

شام کے دُھندلکے میں میری نظر مادام پر پڑی۔ وہ سبزے پر ٹہل رہی تھیں چلتے چلتے کیاریوں کے نزدیک رُک کر ٹارچ جلاتیں، جھکتیں اور کسی پھول کی ڈالی کو سہلا دیتیں۔ ٹھٹھک کر اِدھر اُدھر دیکھتیں، پھر کسی سمت مُڑ جاتیں۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی وہ دیوار سے دیوار تک جاتیں۔

گرمی اور اُمس کے باوجود انھوں نے حسبِ معمول سفید شال اوڑھ رکھی تھی لائبریری کے سائبان کی روشنی میں آئیں تو میں نے دیکھا اُن کے بال بے ترتیب تھے۔ اُن کے پیروں میں جوتیاں بھی نہ تھیں۔ مجھے دیکھ کر گلاب کے خاردار پودوں تک کھسک آئیں۔ میں نے اُنھیں ٹیلی فون پر آیا ہوا ڈاکٹر کا میسج دیا۔ وہ نظریں جھکائے سنتی رہیں۔ ڈاکٹر نے انھیں مزید پرہیز کے لئے تاکید کیا تھا۔ دوائیں بھی بدل گئی تھیں۔ نمک بند کر دیا گیا تھا۔

اِدھر بتدریج اُن کے مرض میں اضافہ ہوا تھا۔ تمام جسم سوجن کا شکار تھا صبح اٹھ کر منہ ہاتھ دھوتے دھوتے بلا ناغہ زرد پانی کی طرح ایک قے ہو جاتی دن بھر متلاتی رہتیں، سر میں شدید درد رہتا۔ بولتے بولتے ہانپنے لگتیں۔ چلتیں تو چکرا جاتیں۔

مدھو نے مجھے بتایا تھا کہ اِدھر راتوں کو ٹھیک سے سو بھی نہیں پاتیں۔ اُن کی بیماری سے سب سے زیادہ مدھو کو ہی پریشانی تھی۔ ہمیشہ ملول رہتی اُنہیں خوش رکھنے کے لئے وہ کیسے کیسے جتن کرتی۔ رسالوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لطیفے ازبر کر لیتی اور اُن کی سنجیدگی پر ان لطیفوں سے گولے باری کرتی۔ وہ کبھی دَبے دَبے ہنستیں۔ کبھی یونہی پیار سے جھڑک دیتیں کبھی ٹال دیتیں۔

رُونو اور شنّو کے تو کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ رسّیاں پھلانگتے، جھولے جھولتے یا کسی گوشے میں بیٹھ کر فلمی دھنیں گنگناتے۔ یہ سارے شوق مدھو کو کبھی نہیں رہے۔ زیادہ سے زیادہ کبھی شطرنج کی بازی میں ساتھ دے دیتی، یا چپ بیٹھ کر اُن کے گانے سُن لیتی تالیاں بجا دیتی۔

مادام کے چہرہ پر یوں نرمی تھی۔ شگفتگی بھی تھی۔ اُن کے لہجہ میں مٹھاس گھلی تھی۔ لیکن اُن کے مزاج میں بڑی کرختگی تھی۔ ضدی بھی تھیں۔ کسی بات پر اڑ جاتیں تو نقطہ برابر ٹس سے مس نہ ہوتیں رکھ رکھاؤ اور ضابطوں کی قائل تھیں بدتمیزی پسند نہیں کرتیں۔ بدسلیقگی سے چڑھ جاتیں۔ کیمپس میں جدھر سے گذر جاتیں۔ سنّاٹا چھا جاتا۔ نگاہیں جھکا کر چلتیں لیکن تنّوں کے کھڑکنے تک کی صدا سے باخبر رہتیں۔

ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہنتی تھیں۔ بس داہنے ہاتھ میں کسی دھات کا ایک پتلا کڑا پہنے رہتیں۔ بائیں ہاتھ میں گھڑی رہتی۔ اُن کے بال یونہی بکھرے ہوتے یا کبھی سیاہ ربن لپیٹ لیتیں یا پھر جُوڑا باندھ لیتیں سیدھی مانگ میں سیندور کی لکیر

کھنچی ہوتی۔ اُن کے بالائی ہونٹوں کے اُوپر ایک بڑا کالا تِل تھا۔

وہ بولتیں تو اُن کے مُنہ سے پھُول جھڑتے۔ مخاطب سے شاذ ہی نگاہ ملاتیں۔ کلائی سے اُوپر ان کے ہاتھ اکثر شال یا ساڑی کے آنچل میں چھُپے رہتے ایک دفعہ میں نے اُن چھُپے ہاتھوں کا راز جان لیا تھا۔ بہت اُوپر تک زخم کے بھدّے نشانات تھے۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا تھا کہ یہ دو سال قبل جل جانے سے ہوا تھا۔ گیس کے چولہے سے شُعلے لپکتے تھے۔ اور اُن کی ٹیریلین کی ساڑی میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے اظہارِ افسوس کیا اور پلاسٹک سرجری کر لینے کا مشورہ دیا۔ وہ دھیمے سے مُسکرائیں۔ آہستہ سے پلکیں اُٹھائیں پھر جُھکا لیں۔

★

ہالی ہوک اور ڈائین تھیس کے سفید، گُلابی، بیگنی پھُولوں کو چھُوتی ہوئی مادام ہولے ہولے قدم اُٹھا رہی تھیں۔ بار بار اُن کی نظر گرد آلود آسمان کی جانب اُٹھ جاتی۔ میرے نزدیک آئیں تو رُکیں۔ تشویشناک انداز میں بولیں۔

"آندھی کے آثار ہیں!"

"شاید!"

میں نے بھی فضا کا جائزہ لیا۔

میں جانتا تھا آندھی سے وہ بہت ڈرتی تھیں۔ پہلے جھونکے کے ساتھ ماسٹر سو کو یا دل میں مقیّد ہو جانا پڑتا! خود مدھو، ڈُلو، شنّو کو سمیٹے اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں۔ اور اُس وقت تک باہر نہیں نکلتیں جب تک کہ ہوا کی

سنسناہٹیں تھم نہ جاتیں۔

اکثر اُنہیں بے خوابی ہو جاتی ڈراؤنے، بھیانک سپنے دیکھ کر ایسے چونک اُٹھتیں جیسے کسی نے اُن کے سینے پر بیٹھ کر اُن کا گلا دبانے کی کوشش کی ہو۔ مدھو جو اُنہیں کے ساتھ سوتی اور اُنہیں کے ساتھ جاگتی تھی۔ اُن کی سسکیاں روکنے کے لئے انہیں تھپکیاں دیتی۔ کبھی رُولو اور شنّو کی نیند کھل جاتی تو وہ بھی رونے لگتیں۔ مدھو اپنے آنسو ضبط کئے رہتی۔

میں نے مدھو کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اُسے بتایا تھا اس میں صبر و تحمّل حد سے زیادہ ہے۔ اپنی سوچیں وہ کسی پہ ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ رُولو بھی کھوئی کھوئی رہنے والی لڑکی ہے شنّو نے اپنی چھوٹی سی ہتھیلی میرے ہاتھوں میں دے کر آہستہ سے صرف ایک سوال پوچھا تھا۔

"مجھے کوئی بھیا ہوگا؟"

میں نے لمبی سانس کھینچی تھی اور اُس کی پیشانی پہ بکھرے ہوئے بال پیچھے ہٹا دیئے تھے۔ پھر بڑی دیر تک اُن کے ساتھ میں بیگاٹیلی کھیلتا رہا تھا۔ ڈائننگ ہال سے برتنوں کی کھنکھناہٹ کی آواز آنی بند ہوگئی تو مادام نے اُنہیں پکارا۔ جاتے جاتے شنّو نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ میں اُسے خاموش، ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اُس نے مجھے جھنجھوڑا۔

"بولئے۔ بولئے نا۔!"

★

صُبح، طلوعِ آفتاب سے قبل ہی مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا پڑا۔ مادام کی

طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ کئی بار بیہوش ہو چکی تھیں۔ گرمی کے دنوں میں ایسے دَورے انہیں اکثر پڑتے تھے۔ اُن کے سر پر پانی کی دھار بہائی جاتی تو تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولتیں۔ پھر فوراً ہی اُن کے دانت بیٹھ جاتے۔

گذشتہ شام دیر تک وہ مجھ سے شاعری کی نئی قدروں پر گفتگو کرتی رہی تھیں۔ ذکرہ کی ناگہانی موت پر غم زدہ تھیں، اروشی، کے کتنے ہی اشعار انھوں نے سنائے اور خوبصورت تشریح بھی کی۔ میں نے اپنی نئی نظم لمس، انہیں نذر کی تو انھوں نے تحسین کے پُل باندھ دیئے۔ انھوں نے بہار کی موجودہ پالیٹکس پر بھی باتیں کیں۔ جے پی کے اُلجھے اُلجھے خیالات پر وار کیا۔ مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان تناؤ کا ذکر کیا اور انسانیت کو درپیش مسئلوں پر روشنی ڈالی۔ اُن کی سمجھ بوجھ پر میں دنگ تھا۔

ڈاکٹر کے آنے تک مادام کی ہتھیلیاں، تلوے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ رُونو اُن کے تلوے سہلا رہی تھی۔ مدھو تولیہ سے اُن کے بال خشک کر کے تیل ملا رہی تھی۔ مادام ہلکے ہلکے کراہ رہی تھیں۔ اُن کے بازو میں پڑی کرسی پر بیٹھا ہوا میں گھڑی کی سوئیوں کی تیز رفتاری دیکھ رہا تھا۔ شنو میری گردن میں بانہیں ڈالے ہوئے چپ کھڑی تھی۔

مادام نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

رُونو نے اُنہیں پکارا۔

"ماں! ماں!!"

شنّو نے بسورتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"پاپا کہاں ہیں؟"

اگر یہی سوال اُس نے پہلے کبھی کیا ہوتا تو مادام نے اُسے تھپڑ مار دیا ہوتا لیکن آج اُن کی بوجھل پلکیں اُٹھیں، کانپیں، اندر کوئی تھما ہوا قطرہ جھلملایا اور اُنھوں نے شنّو کو کھینچ کر لپٹا لیا۔

★★

اِک مُضطرب سی تمنّا

سامنے وہ راہداری تھی، پھر زینہ، پھر سبزہ، پھر روشیں، پھولوں کی ڈالیاں انگور کے خوشے، گلاب کی ٹہنیاں، عشق پیچاں کی نازک بیلیں..... جہاں تک تنوجہ کی نگاہیں پہنچ سکتی تھیں. وہاں وہاں سُینل کے نقوش واضح ہوتے تھے اور سُجاتا کی پرچھائیاں اُبھرتی تھیں.

سُجاتا کا چہرہ کتابی تھا. اُس کا قد درمیانہ تھا. اُس کے جسم کی تراش کچھ ایسی ہی تھی جیسی کہ کبھی کسی دلفریب تصویر میں نظر آجاتی ہے. اُوپر اور نیچے کے حصّے میں گہرا توازن تھا. ہر عضو کی ساخت میں ہم آہنگی تھی. کوئی حصّہ حد سے زیادہ دبا، حد سے زیادہ پھیلا، یا حد سے زیادہ اُبھرا ہوا نہیں. معلوم ہوتا تھا. اُسے دیکھ کر پہلے پہل تنوجہ کو اپنے پیّا کی اسٹیڈی میں رکھی شانتی نی کیتین کی یادگار وہ پتھر کی مورت یاد آگئی تھی. جو اُس کے اپنے ہاتھوں کی تراشیدہ تھی. جو اُس کے تصوّر کی تخلیق تھی. اُس کی کمر ویسی ہی خمیدہ تھی، اُس کی گردن ویسی ہی جُھکی جُھکی تھی. سُجاتا کی آنکھیں بڑی پُر اسرار تھیں. پپوٹے بھاری تھے نشے میں ڈوبی ہوئی وہ آنکھیں تنوجہ کو اتنی پسند تھیں کہ اپنے بہت سارے خاکوں میں اُس نے ایسے ہی خُمار کا رنگ پینیٹ کیا تھا.

حُسن، دلکشی، رعنائی کی تلاش میں تنوجہ کی نگاہیں ہمیشہ سرگرداں رہتیں.

کوئی حسین چہرہ، کوئی خوبصورت منظر، کوئی جاذب نظر عکس، اُسے تحریک دیتا لکیروں رنگوں کے سحر میں وہ گم ہو جاتی۔ اُس کی بنائی ہوئی تصویریں جیتی جاگتی اُن میں زندگی کی لہک ہوتی، اُن میں حقیقت کا قرب جھلکتا۔ ساگر کی گود میں پناہ لیتے ہوئے سورج کو، بادلوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے۔ چاند کو سمندر کی بے قرار موجوں کو، تڑپتی ہوئی ہیروئن کو، محجوب سی دُلہن کو..... اُس نے اپنے تصور کا دیدہ زیب جامہ پہنایا تھا۔

تنو جہ تیلی، دُبلی اور لانبی تھی۔ ممی یاد دلاتی تھیں، بچپن میں وہ بہت تنومند اور تونگر تھی۔ تیزی سے وہ اوپر سرکنے لگی۔ نو سال کی جب ہوئی تو ممی کے کندھوں تک پہنچتی تھی، گیارہ سال میں اُن کے سر سے جا لگی اور تیرہ سال مکمل ہوتے ہوتے وہ ان سے چھ انچ اوپر نکل گئی۔ اب وہ سڈول، سجیلی نہ رہی، جسم کے خطوط بے ہنگم ہو گئے، جیسے وہ صنف نازک نہ ہو بلکہ تجریدی آرٹ کا کوئی نمونہ! اب اُسے اپنی ہی صورت اجنبی سی لگتی، کیا اس نے ایسا ہی چاہا تھا، ایسا ہی سوچا تھا؟ —— سوکھی، بے ڈول باہیں، سپاٹ سینہ، بیٹھے بیٹھے کولھے، چھوٹی دھنسی ہوئی، چمک سے عاری آنکھیں، اُن کے گرد سیاہ حلقے، لمبوترہ چہرہ، دبلے ہوئے گال، جا بجا مہاسے، پھیلی ہوئی بھدّی سی ناک، ہونٹوں میں سُرخی نہیں، رس نہیں، پیشانی کوتاہ، حتیٰ کہ سر کے بال بھی بھورے نہایت چھوٹے، گردن سکڑی ہوئی، دانت ناہموار —— اُس کی شخصیت میں کوئی بھی ایسا گوشہ تو نہ تھا۔ جو پُرکشش ہو، جسے چھونے پانے کی کوئی خواہش کر سکے۔

اپنی کمیوں، کوتیاہیوں سے تنوجہ بہرطور واقف تھی، اسی لئے آئینہ میں وہ اپنے کو بہت کم دیکھتی، جب دیکھتی تو اُداس، مضمحل ہو جاتی۔ بے اختیار روہانسی ہو جاتی اُس کی سوچوں کے درمیان ہی چھناکے سے شیشہ ٹوٹ جاتا اور اس کی کرچیاں اس کے دِل کے قریں چُبھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

معبود کی ساری کاریگری، ساری صنّاعی کے سوتے کیا اُس کی تخلیق کے وقت سُوکھ گئے تھے؟ شیو نے جب سمندروں کا منتھن کیا تھا اور سنسار کا سارا زہر اپنے حلق میں اُتار لیا تھا، کیا اُس کی بدقسمتی کا زہر پینا وہ سرے سے بھول گئے تھے؟ کیا کائنات کی ساری خوبصورتی سرسوتی، پاروتی، لکشمی نے اپنے لئے مخصوص کرلی تھی؟ دُرگا کی شکتی کہاں تھی۔ شنکر کا پرکوپ کہاں تھا؟ ہے بھگوان کیا تمہاری تیسری آنکھ کھلنے تک سنسار کا یونہی اُتھل پُتھل ہوتا رہے گا...!!

تنوجہ کی فطرت میں سادگی کو بڑا دخل تھا ـــــ سادہ کپڑے، سادہ اطوار، سادہ سی مُسکراہٹ! بیلے کے معصوم غنچے، جوہی کی شفاف کلیاں، ہنستے ہوئے گلاب، ہمکتے ہوئے بچے، حِنا آلود اُنگلیاں، پشیماں سی آنکھیں اس کے لئے بڑی کشش رکھتیں۔ رنگوں کے امتزاج کا اُسے بے حد سلیقہ تھا۔ لیکن اپنے لئے ترجیح کا مسئلہ آتا تو وہ صرف سفید پسند کرتی ـــــ سفید، جس میں سنجیدگی ہے، تمکنت ہے۔ وقار ہے۔!!

ممّی کہتی بھی تھیں ـــــ

"کیسی آرٹسٹ ہو تم؟ اتنے سارے خاکوں میں حسین رنگ آمیزی کا کتنا خیال رکھتی ہو ـــــ یہ شفق کی سُرخی ہے۔ یہ آسمان کی نیلاہٹ، یہ سبز ے

کی ہریالی، یہ آنکھوں کی گلابی، یہ رخساروں کا صندلی رنگ ـــــ اور آئینہ تو دیکھو اپنی آنکھوں میں کاجل کی حاشیہ آرائی تک نہیں ـــــ کان سُونے، کلائیاں سونی !"

"ممی! ممی ڈارلنگ! میں آپ کی ایک ایسی پورٹریٹ بنانا چاہتی ہوں جس میں، آپ اپنے سہاگ کا جوڑا پہنے ہوں، چہرے پر وہی دُلہنوں جیسا حجاب ہو۔ آنکھوں میں وہی حیا ہو، وہی ....."

"دھت! شریر کہیں کی ـــــ چائے بھجوا دوں؟" وہ سچ مچ خجل ہو جاتیں۔ اُن کے لہجہ میں بے پناہ چاہت سمٹ آتی۔

"تھینک یو ممّی! یہ دیکھا تم نے؟ غالب کی آئل پینٹنگ! اسے میں نے غالب صدی کی یاد میں بنایا ہے ـــــ بازیچۂ اطفال ہے دُنیا میرے آگے"

تنوجہ یاسیت، حُزن، ملال کو دبیز رنگوں میں چُھپا دیتی۔ قہقہے لگا کر سمندر کی طرح شانت ہو جاتی۔ ممی اُس کے مزاج کے انداز کو سمجھنے لگی تھیں۔

یہ ہلکا ہلکا تبسّم جو تنوجہ کے ہونٹوں پر رقص کر رہا ہوتا۔ سبھی کتنے نشتر چبھو جاتا۔ اُس کے لہجے کی شوخی کبھی پژمردہ سی لگتی۔ دِل کی فسردگی پہ کتنے بھی رنگ چڑھا لئے جائیں، وہ بے حجاب تو ہوتی ہی ہے ـــــ ممّی تنوجہ کی کسک پہچانتی تھیں۔ وہ جو خود حسن کا دلدادہ تھی حسن کی تخلیق کرتی تھی۔ حسن کو آراستہ کرتی تھی ـــــ اپنی تاریکیوں کے لئے اپنا دامن بھگوتی تھی۔ کوئی سیتا نہ سہی، کوئی گوپی نہ سہی۔ کوئی مکمل عورت تو ہو سکتی تھی۔ عورت میں اگر جمال کا پرتو نہ ہو تو نسائیت کبھی مکمل نہیں ہوتی!

شب کی تنہائیاں کبھی تنوجہ کو بے کل کر دیتیں۔ ہر رُخ بے چینی ہر طرف خاموشی، ہر سمت اداسی ہزیمت کے اِس احساس میں صرف سُنیل کی یادیں اُسے سکون بخشتیں۔ سُنیل کا ہنستا ہوا چہرہ، اُس کی خندہ زن آنکھیں، اُس کے مُسکراتے ہونٹ بیتے دنوں کی یاد دلاتے۔ تنوجہ کو یاد تھا پُرانی ڈگر پر دونوں ساتھ ساتھ چلے تھے۔ — کھیتوں میں، میدانوں میں دوڑتے دوڑتے تھک جاتے، باغوں میں آنکھ مچولی کھیلتے، چاند کو تکتے رہتے، ستاروں تک پرواز کی باتیں کرتے — ریگ زاروں پر گھروندے بنائے تھے۔ سمندروں کی لہروں سے کھیلے تھے۔ گڈّا، گڑیا، کے تماشے کئے تھے۔ ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈال کر سوئمبر بھی رچاتی تھی۔

سامنے ہی روِشوں، گلاب کی ٹہنیوں، چنبیلی کے منڈوؤں سے پرے کبھی دُھلی ہوئی چاندنی رات میں دو سائے سِمٹ کر ایک ہو جاتے تو بے اختیار تنوجہ کو سُنیل کے ساتھ ساتھ سُجاتا کی یاد بھی آتی۔ سُنیل جو موم کے مجسّمہ کی طرح تھا۔ سُجاتا جو پتھر کی مُورت کی طرح تھی۔ کس وقار کس تمکنت کے ساتھ دونوں خراماں چلتے۔ وہ اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا، وہ اُس کی گردن میں بانہیں ڈال دیتی۔ دونوں مُسکراتے تو غنچے چٹک جاتے۔ وہ اُس کے بازوؤں میں سمٹی ہوتی، وہ اُس کی سانسوں سے پگھلتا ہوتا۔۔۔

سُنیل اور سُجاتا کو پاس پاس دیکھ کر تنوجہ کے ذہن میں کتنے ہی

رنگ رنگ کے خاکے اُبھرتے ـــــ جیسے کِھلتے ہوئے گلاب کی دو کلیاں، محوِ پرواز دو ہنسوں کا جوڑا، صبح و شام کی دھندلاہٹوں میں عجیب و زرد کا ملن! وہ گویا کھو سی جاتی، چاہتی اُنہیں پھولوں سے بجا دے، اُن کی آرتی اتارے، اُن کے قدموں میں سر رکھ دے....!!

★★